© rasailojaraid.com

تحریک ہجرت اور اسکا پس منظر

غلام حسین ذوالفقار

جنوبی ایشیا میں تیموری سلطنت کے زوال و انحطاط کے ساتھ ہی اہل فکر و نظر کو سیاسی حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا اور سرفروش مجاہدین آزادی کی جدوجہد کا آغاز بھی اس کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ محکومی کی شب تاریک کے سائے جیسے جیسے گہرے ہوتے گئے، شمع آزادی کے پروانے بھی اپنی جانوں کا نذرانہ لے کر میدان عمل میں نکلے اور اہل وطن کی خفتہ قسمت کو جگانے کی سعی میں مصروف ہو گئے ... دو صدیوں پر پھیلی ہوئی اس تیرگی شب میں یہ کوششیں جگنو کی چمک کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ ہماری تاریخ کا یہ ایک بہت ہی نازک دور ہے جس میں یاس کی تاریکی کے ساتھ ساتھ امید کے جگنو بھی جگمگاتے اور طلوع سحر کی نوید سناتے رہے۔ بالآخر طلوع سحر کی وہ ساعت سعید قریب آنے لگی اور گمشدہ منزل دھندلکوں میں لپٹی ہوئی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگی۔ یہی ہے وہ زمانہ جسکی داستان کا ایک پارینہ ورق اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

تیموریوں کے مرکزی نظام کے درہم برہم ہو جانے اور جنوبی ایشیا میں طوائف الملوکی پھیل جانے سے ملک میں افراتفری اور لوٹ کھسوٹ کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوا جس نے بیرونی طاقتوں کو سلطنت کے اندرونی مسائل میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ شمال مغرب سے نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں، اندرون ملک مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی شورشوں اور خود غرض و سرکش امرائے سلطنت کی تخت و بخت کے لئے خانہ جنگیوں، ان سب نے مل کر نظم و نسق کو اتنا بگاڑ دیا کہ افرنگی تاجروں کو اپنے استعماری اقتدار کے لئے میدان صاف نظر آنے لگا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس اکھاڑ پچھاڑ میں کامیاب ہو کر نکلی اور پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی تک پورے جنوبی ایشیا پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد کمپنی کا دور اقتدار ختم ہوا اور برعظیم میں تاج برطانیہ کے زیر سایہ یونین جیک لہرانے لگا۔ دیسی باشندوں سے آزادی کی متاع گراں مایہ چھن گئی اور ایک اجنبی استعماری طاقت ہزاروں میل دور بیٹھی اس ملک پر حکومت کرنے اور اس خطے کے زرعی و معدنی وسائل اور یہاں کے عوام کا استحصال کرنے لگی۔ غلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمدانی مصحفی (وفات ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء) کا یہ شعر ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالی دور کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہندوستان میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

برعظیم جنوبی ایشیا کے دور محکومی کو دو ادوار میں تقسیم کر کے اس روداد کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلا ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور استبداد جو پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء سے شروع ہو کر آزادی کی جنگ ۱۸۵۷ء کی ناکامی پر ختم ہوا، اور دوسرا دور تاج برطانیہ کے سانے میں ۱۸۵۸ء سے شروع ہو کر اگست ۱۹۴۷ء میں آئینی و دستوری جدوجہد میں گزرا ... اور بالآخروہ روز سعید آیا کہ جنوبی ایشیا کے باشندے اپنی متاع گم شدہ "آزادی" کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ تلاش و جستجو کی یہ داستان بڑی طویل بھی ہے اور دلگداز بھی، جسے ہم نے یہاں سہولت کی خاطر دو ادوار میں تقسیم کیا ہے تاکہ مختصر طور پر یہ بتایا جاسکے کہ اس عمل میں کتنا تسلسل اور تواتر رہا ہے جو بظاہر تو نظر نہیں آتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اجنبی اقتدار جو شروع ہی سے استعماری سازشوں اور جبر و استبداد کے ساتھ ملک میں پھیلا، اپنے بعض رفاہی کاموں کے باوصف دیسی باشندوں کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ خصوصا مسلمانوں کے لئے جو اس ملک میں آٹھ سو سال سے حکمران تھے اور اس بنا پر برطانوی استعمار نے انھیں خصوصی طور پر اپنا ہدف بنا لیا تھا۔ جبکہ موقع پرست ہندوؤں کے لئے اجنبی اقتدار سے مفاہمت پیدا کرنے کی راہ میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی، اس بدلتے ہوئے منظر کو سب سے پہلے اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے محسوس کیا اور اسلامی معاشرے کی اصلاح احوال کی تحریک کا آغاز کیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بنگال سے لے کر مغربی سرحد تک اور شمال سے لے کر جنوب تک جہاد کی پکار کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ سید احمد بریلوی، حاجی شریعت اللہ، تیطو میاں، حافظ رحمت خان کی جدوجہد اسی سلسلہ جہاد کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں بھی اس تحریک کے کارکنوں (علماء) نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہاں ناکامی کے بعد شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔

نواب سراج الدولہ، سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی سے محاذ آرائیاں بھی کھوئے ہوئے قومی وقار کو بحال کرنے اور آزادی کے بجھتے ہوئے چراغوں کو اپنا خون دے کر روشن کرنے کی مجاہدانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوششیں تھیں جو ناکامی سے دو چار ہوئیں ۔ سلطنت خداداد میسور کے سلطان ٹیپو کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے استعماری اقتدار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا ، کیونکہ سلطان نے نہ صرف ملک کے اندر منتشر دیسی طاقتوں کو افرنگی سامراج کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دی بلکہ عثمانی سلطان عبدالحمید اول کی خدمت میں سفارتی وفد بھیجا (۱۷۸۷ء) ۔ افغانستان اور ایران کے بادشاہوں کو بھی خطوط لکھے اور فرانس کے نپولین بونا پارٹ سے بھی رابطہ قائم کیا ۔ انگریزوں کے خلاف مقاومت کی یہ سب سے بڑی منظم کوشش تھی جو ناکام رہی ۔ اسی لئے سرنگاپٹم کی تسخیر اور سلطان ٹیپو کی شہادت (مئی ۱۷۹۹ء) پر برطانیہ میں جشن مسرت منایا گیا کیونکہ برطانوی استعمار کی راہ میں حائل ایک بہت بڑی چٹان ہٹ گئی تھی ۔

پلاسی کی جنگ سے لے کر (جس میں سراج الدولہ شہید ہوئے) ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی تک راہ حق پر قربان ہونے والوں کی داستان کو دیکھا جائے تو یہ تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے ۔ یہ لوگ جہاد آزادی کی خاطر خاک و خون میں مل گئے مگر آنے والی نسلوں کو یہ درس حیات بھی دے گئے کہ محکومی ہمارا مقدر نہیں ہو سکتی ۔ صبح آزادی کے طلوع کے لئے ایثار و قربانی کے بغیر چارہ نہیں ۔ کیونکہ آزادی چھن جائے تو یہ اپنی بازیافت کے لئے خون کا نذرانہ مانگتی ہے ع

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا !

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دلی کے لال قلعے میں تیموریوں کے اقتدار رفتہ کی ٹمٹماتی ہوئی شمع بھی بجھ گئی اور تاریکی کے سائے اور بھی گہرے ہو گئے ۔ آزادی کے لئے ملت کا عزم و ارادہ تو اس ناکامی کے بعد بھی نہیں بدلا مگر جدوجہد کے طور طریقے بدل گئے ۔ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے اصلاحی اور دستوری تحریکیں شروع ہوئیں ۔ کیونکہ اب نہتے جمہور کا مقابلہ ایک ایسی استعماری طاقت کے ساتھ تھا جس کی سلطنت پر کہیں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اور جو حربی قوت و صنعت ہی میں دنیا کی صف اول کی طاقت نہیں تھی بلکہ اپنی ڈپلومیٹک سیاست میں بھی سب استعماری طاقتوں کی سرخیل بنی ہوئی تھی ۔ اس عالمی طاقت سے ٹکر لینے کے لئے انہی سیاسی حربوں کی ضرورت تھی جس سے اس کے غرور کا سر نیچے کیا جا سکے ۔ چنانچہ جنوبی ایشیا میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اصلاحی تحریکیں اور آئینی و دستوری حدود کے اندر بتدریج سیاسی عمل شروع ہوا ، جو عالمی سیاسی تناظر میں اہل وطن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قلوب میں نئے حوصلے اور نئی امنگیں پیدا کرتا چلا گیا۔ خصوصا بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ جنوبی ایشیا اصلاحی دور سے نکل کر دستوری خود مختاری کے حصول کی منزل میں آگیا اور لوگوں میں آزادی کا شعور پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ آزادی کی راہ میں ایثار و قربانی کی تڑپ پیدا ہونے لگی۔ ادیب اور شاعر اس درد و کرب کو ابھارنے میں پیش پیش تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ جاپان کے چھوٹے چھوٹے جزائر میں بسنے والی ایک گمنام سی قوم نے روس جیسی سلطنت کو شکست دے کر دنیا کو حیران کر دیا (۱۹۰۵ء)۔ اس واقعے کا بڑا گہرا نفسیاتی اثر جنوبی ایشیا کے عوام پر پڑا اور لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ عالمی طاقتوں کو بھی ناقابل تسخیر جذبے اور حوصلے سے سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔

بعض ناگزیر تاریخی حالات کی وجہ سے جنوبی ایشیا کے مسلمان جدید تعلیم میں بھی اور سیاست میں بھی ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ہی موقعہ شناس ہندوؤں نے انگریزی اقتدار سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جبکہ حالات نے مسلمانوں کو انگریزی اقتدار کے خلاف محاذ آرائی پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر ہم اس امر واقعہ کو سامنے رکھیں کہ بنگال میں جدید تعلیم کے سلسلے میں پہلا ہندو کالج ۱۸۱۷ء میں قائم ہوا، اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا پہلا جدید تعلیمی ادارہ علی گڑھ میں ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج کے نام سے قائم ہوا، تو یہ بعد زمانی پورے ساٹھ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اقتصادی حالات پر غور کریں تو یہ اس سے بھی بدتر نظر آئیں گے، جن پر برطانوی حکومت کی رپورٹیں بھی گواہ ہیں (مثلاً سر ولیم ہنٹر کی رپورٹ (The Indian Musalmans (۱)۔ اسی طرح انگریزوں کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں ہوا، جس میں جدید تعلیم یافتہ ہندو پیش پیش تھے اور مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں ہوا، تو سیاسی عمل کا یہ بعد بھی اکیس سال کا ہو جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سنگین حالات کی گرفت سے نکلنے اور اپنے مقدر کو سنوارنے کے لئے مسلمانوں کو کچھ وقت تو ضرور لگا مگر جب وہ بتدریج جد وجہد کے میدان میں نکل آئے تو بڑی تیزی سے وہ اس بعد کو ختم کرنے اور اس تعلیمی، سیاسی، اقتصادی خلا کو پر کرنے کی کوشش میں مگن ہو گئے۔ کچھ نئی صدی کے حالات نے اور عالمی تقاضوں نے ان کی جد وجہد کو مہمیز لگائی۔ ایک مختصر اور گمنام ایشیائی قوم نے اپنے جذبے اور حمیت سے انہیں ایک بڑا نفسیاتی درس دیا تھا۔ پھر مسلمانوں نے یہ بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی نظر انداز نہیں کی تھی کہ جنوبی ایشیا میں رہتے ہوئے بھی وہ ایک عالمگیر امت کا حصہ ہیں اور اپنی آزادی کم کر دینے کے بعد تو وہ اپنے آزاد اور نیم آزاد بھائیوں خصوصاً عثمانی ترکوں کے بارے میں بہت حساس ہو گئے تھے، اور ان کی خوشیوں کو اپنی خوشی اور ان کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھنے لگے تھے۔ یہی سبب ہے کہ یورپ کی استعماری طاقتوں کے خفیہ معاہدوں اور سازشوں کے نتیجے میں جب ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے طرابلس (لیبیا) پر چڑھائی کر دی اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی مسیحی ریاستوں نے متحدہ محاذ بنا کر یورپی ترکی پر یلغار کر دی اور ادرنہ پر ان کا قبضہ ختم ہو گیا اور مقام خلافت (استانبول) خطرے میں پڑ گیا تو جنوبی ایشیا کے مسلمان تڑپ اٹھے اور محکومی کی حالت میں جو کچھ ان کے بس میں تھا، وہ کر گزرے۔ بلقان کے محاذ جنگ پر طبی وفد بھیجنے کے علاوہ لاکھوں روپے چندہ جمع کر کے استانبول بھیجا گیا۔ مسلم خواتین نے اپنے طلائی زیور اتار اتار کر چندے میں دے دیے۔ بعض ماؤں نے تو اپنے بچوں کو بھی چندے کے لئے نیلام میں دے دیا۔ ہم آج ۸۰ برس بعد اس جذبے کا تصور بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔ یہ جذبہ ایک نئی روح کا مظہر تھا۔

مقامی حادثات و سانحات نے بھی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو آتش زیر پا کر دیا تھا۔ دلی کے شاہی دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر تقسیم بنگال کی حتمی تقسیم کو منسوخ کر کے برطانوی استعمار نے وفادار مسلمانوں کو ایک تازیانہ عبرت رسید کیا۔ پھر کانپور کی مسجد کے سانحے ۱۹۱۳ء میں شہدا کے خون بے گناہ نے ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تعلیم اور سیاست میں پس ماندہ مسلمان جذب و شوق میں اتنا آگے بڑھ آئے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ مساوی سطح پر آ گئیں اور ۱۹۱۶ء میں مسٹر محمد علی جناح کی کوششوں سے ان دونوں سیاسی جماعتوں میں برعظیم کی دستوری خود مختاری کے لئے ایک سمجھوتہ ہو گیا جو تاریخ میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہوم رول تحریک میں بھی ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ متحرک تھے۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے تو عثمانی سلطنت کی شکست و ریخت کے ساتھ خلافت کے مسئلے نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا اور جب موہن داس کرم چند گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیاگرہ کا پروگرام پیش کیا تو مسلمان سب سے پہلے سول نافرمانی کی اس آگ میں کودنے کے لئے تیار ہو گئے اور تحریک خلافت اور ترک موالات میں گاندھی کی رہنمائی میں مسلمان سب سے آگے آگے تھے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی قوت عمل میں یہ حیرت انگیز اور برق رفتار تبدیلی گزشتہ دس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سال کے عرصے میں آئی ، ورنہ وہ پہلے سرسید احمد خان کی بتائی ہوئی وفاداری کی راہ سے قدرے ہٹ کر نئی سیاسی راہوں پر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ۔ مسلمانوں کی اس قوت عمل کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی کرنا پڑا ہے (۲) ۔

> . . . the Muslim intelligentsia was trying hard to break through from the fetters that kept it back and to range itself beside the Congress. Within a decade the Indian Muslims seemed to have outstripped the Congress and were actually giving the lead to it. But these ten years were momentous years, and the Great War had come and gone and left a broken-down world as a legacy.

یہاں تک ہم نے تاریخی پس منظر کا خاکہ از حد اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ اب جبکہ ہم موضوع زیر بحث یعنی تحریک خلافت ، ترک موالات اور ہجرت پر پہنچ گئے ہیں ، ہمیں کسی قدر تفصیل سے کام لینا ہوگا ۔ مسلم ہند کی بیداری کے سلسلے میں ہم چند برس پہلے کے اس منظر کی طرف آتے ہیں جب طرابلس اور بلقان کی جنگیں چھڑیں تو شاعر مشرق علامہ اقبال نے شکوہ ، جواب شکوہ ، شمع و شاعر جیسی طویل اردو نظموں کے علاوہ محاذ جنگ کے واقعات کے حوالے سے چند مختصر اور مؤثر نظمیں ، حضور رسالتماب میں ، فاطمہ بنت عبداللہ ، محاصرہ ادرنہ وغیرہ لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں ایثار و قربانی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی ۔ جب ستمبر ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ چھڑی تو مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" کو روزنامہ کرکے میدان جنگ کی تازہ خبروں کے ساتھ اقبال کی اور اپنی ولولہ انگیز نظموں کو صفحہ اول پر شائع کرکے عوام کے لہو کو گرمانا شروع کردیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے "زمیندار" جنوبی ایشیا کا مقبول ترین اُردو روزنامہ بن گیا ۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر نے انگریزی میں "کامریڈ" اور اردو میں "ہمدرد" جاری کیا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جون ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا اور دین کے حوالے سے سیاست کے میدان میں آکر حریت و آزادی کی دعوت کا آغاز کیا ۔ "زمیندار" ملک میں جمہور کی آواز بن گیا اور ان پڑھ لوگ بھی دو پیسے میں زمیندار خرید کر ایک آنہ اس کی پڑھائی پر خرچ کرکے عالم اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور اپنے آتشیں جذبات کو تسکین دیتے ۔ "کامریڈ" انگریزی خواں طبقے میں مقبول ہوا اور "الہلال" نے دعوت و ارشاد میں دینی رومانیت کا ایسا خطیبانہ لہجہ اختیار کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ خواص کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور عوام بھی اس کے بلند آہنگ لہجے سے مبہوت ہونے لگے۔

"زمیندار"، "کامریڈ"، "ہمدرد" اور "الہلال" محض صحیفے ہی نہیں تھے بلکہ اتحاد اسلامی تحریک کی حمایت کے ساتھ ساتھ ملکی آزادی کے علم بردار بھی تھے۔ ان جریدوں نے سیاست، صحافت، خطابت، شعر و ادب کی ایک زندہ و تابندہ روایت قائم کردی اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو حریت و انقلاب کی ایک نئی شاہراہ دکھا دی۔ برطانوی استعمار نے بھی حریت و آزادی کی ان آوازوں کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی اور پریس ایکٹ کے تحت اخبار اور مطبع کی ضمانت طلبیوں اور ضمانت ضبطیوں کے استبدادی حربوں کو پے در پے آزمایا مگر جمہور نے بھی اپنے ضمیر کی ان آوازوں کو ساکت نہ ہونے دیا اور ایثار و قربانی کی ایک نئی مثال قائم کر دی۔ ان صحیفوں نے چند سال کے اندر جنوبی ایشیا کی ملت اسلامیہ کو انقلابی دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ عظیم صحافی رہنما مختلف مقامات پر نظر بند کر دیے گئے اور "الہلال"، "کامریڈ"، "ہمدرد" اور "زمیندار" کی حریت پرور صدائے حق بھی خاموش کر دی گئی مگر جس "مشن" کو لے کر یہ نوجوان صحافی میدان صحافت و سیاست میں آئے تھے، وہ پورا ہو چکا تھا۔ جمہور میں نیا شعور اور سیاسی بیداری آگئی تھی۔ ان صحافیوں نے لوگوں کے دلوں میں جذبات کا جوالا روشن کیا تھا، وہ ان کے نظر بند ہو جانے کے باوجود سلگتا رہا۔ جنگ عظیم میں عثمانی ترکوں نے جرمنی کے حلیف کے طور پر جنگ میں شرکت کی تو اس کے ساتھ ہی خلیفۃ المسلمین کی طرف سے جہاد کا اعلان شائع ہوا۔ جنوبی ایشیا میں مجاہدین کی زیر زمین تحریک بھی حرکت میں آگئی۔ اسی تحریک کی سرپرستی میں لاہور کے کچھ کالجوں کے طلبہ نے جہاد کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ٦ جنوری ١٩١٥ء کو دریائے راوی پر پہنچ کر قرآن کریم پر جہاد میں شرکت کے لئے حلف اٹھایا اور ایک ماہ کی تیاری کے بعد سرحدی قبائل کے علاقے سے گزرتے ہوئے افغانستان پہنچ گئے۔ افغانستان کے امیر حبیب اللہ انگریزوں کے وفادار حلیف تھے۔ چنانچہ یہ طلبہ وہاں نظر بند کر دیے گئے۔ اسی سال شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے حکم پر ان کے شاگرد خاص مولانا عبیداللہ سندھی بھی کوئٹہ، قندھار کی ویران راہوں سے گزرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچ گئے اور نوجوان طلبہ کی رہنمائی کرنے لگے ۔ اسی دوران ایک ترک جرمن مشن بھی کابل آیا اور یہاں ایک موقتہ حکومت ہند بھی تشکیل دی گئی جس کے سربراہ راجہ مہندر پرتاپ ، وزیراعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے (اس ہجرت اور جہاد کی روداد ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی "خاطرات" (۳) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے ۔ ظفر حسن موقتہ حکومت ہند کے سیکرٹری بھی تھے) ۔ ۱۹۱۵ء میں نوجوان طلبہ اور مولانا عبیداللہ سندھی کی ہجرت برائے جہاد اس عام ہجرت سے مختلف اور الگ ہے جو چند سال بعد تحریک خلافت اور ترک موالات کے دوران شروع کی گئی ۔ عام قارئین تو ایک طرف ، اکثر مصنفین اور مورخین بھی اس فرق سے آگاہ نہیں ہیں ، اس لئے ان سب مہاجرین کو ایک ہی تحریک ہجرت کے سلسلے میں شمار کر لیا جاتا ہے ۔ بہرحال ، اس ہجرت عام کی بحث آگے آتی ہے جس میں قومی ادارہ تحقیق تاریخ و ثقافت کی شائع کردہ کتاب "آزادی کی تلاش" (ترجمہ سید وقار علی شاہ از پشتو) کے مؤلف میاں اکبرشاہ (۴) نے بھی چند ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کی اور اس کتاب میں اپنے آوارہ وطن ہونے اور طرح طرح کے مصائب برداشت کرنے کی روداد بیان کی ہے ۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوگئی ۔ جنگ کے دوران جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور فوجی بھرتی حاصل کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے موقع بموقع پرفریب اعلانات کئے تھے مگر جنگ کے فوراً بعد ان سب وعدوں کو طاق نسیان پر رکھ دیا گیا اور ترکی کے بارے میں عارضی صلح نامے میں ایسی سخت شرائط رکھی گئیں جو فریق مخالف کے کسی دوسرے ملک (جرمنی) سے کہیں زیادہ شدید تھیں ۔ قول اور فعل کا یہ تضاد ملاحظہ فرمائیے ۔ خلیفۃ المسلمین کے اعلان جہاد کے بعد اس کا اثر زائل کرنے کے لئے حکومت برطانیہ نے یہ اعلان کیا کہ

ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین کر لینا چاہیئے کہ ہم یا ہمارے اتحادی اس جنگ میں کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے ۔ اسلام کے مقدس مقامات بیحرمتی سے محفوظ رہیں گے اور ان کی حرمت قائم رکھنے کی ہر ممکن احتیاط برتی جائے گی ۔ اسلام کے مقدس دارالخلافہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی ۔ ہم صرف ترکی وزراء سے لڑ رہے ہیں جو جرمنی کے زیر اثر ہیں ، نہ کہ خلیفۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المسلمین سے ۔ برٹش گورنمنٹ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اتحادیوں کی طرف سے بھی ان مواعید کی ذمے داری لیتی ہے (۵) ۔

مگر ترکوں کو عارضی صلح نامے کی جو شرائط پیش کی گئیں وہ ان سب وعدوں کی نفی کرتی تھیں ۔ یہ ذلت آمیز شرائط ملاحظہ کیجئے ۔

۱۔ کل ترکی فوج غیر مسلح کر دی جائے ۔

۲۔ تمام جہاز اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں ۔

۳۔ دردانیال Dardanelles اور باسفورس اوران کے علاوہ وہ قلعے جو یہاں ہیں، سب کو خالی کرکے اتحادیوں کے حوالے کر دیا جائے ۔

۴۔ اتحادیوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ فوجی نقطہ ءنظر سے جو بھی مقام وہ اہم سمجھیں، اس پر قبضہ کر لیں ۔

۵۔ ترکی ریلوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں رہے گا ۔

۶۔ تمام ترکی بندرگاہیں اتحادیوں کے لئے کھول دی جائیں گی ۔

۷۔ تمام تارکی لائنیں اتحادیوں کے کنٹرول میں دے دی جائیں گی ۔

۸۔ ترکی افواج کے جو لوگ گرفتار ہوگئے ہیں وہ سب قید رہیں گے ۔

۹۔ ترکی افواج جو حجاز اور طرابلس میں ہیں ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا ۔

۱۰۔ اتحادی فوجوں کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں، وہ فوراً رہا کر دیئے جائیں گے ۔

ان ذلت آمیز شرائط کے ساتھ اتحادی افواج نے استانبول پر قبضہ کر کے خلیفۃ المسلمین کو اپنے قبضے میں کر لیا ۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا اور مئی ۱۹۱۹ء کے شروع میں یونانی افواج برطانوی جنگی جہازوں پر سوار ہوکر سمرنا میں اتریں اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام کر کے اناطولیہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ۔ یہ تھے وہ حالات جنہوں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑا دی اور وہ سراپا احتجاج بن گئے ۔

دوسری طرف فتح کے نشے میں چور برطانوی حکومت جنوبی ایشیا میں کسی قسم کی احتجاجی کارروائی اور سرگرمی کو روکنے کے لئے رولٹ بل، ایک جابرانہ قانون بنانے اور اسے نافذ کرنے پر تل گئی ۔ اس بل کی اشاعت نے اہل ہند کو حیران کر دیا اور وہ اس کی مخالفت پر تل گئے ۔ عارضی صلح نامہ کی شرائط اور رولٹ بل نے (جو مارچ ۱۹۱۹ء میں ایکٹ یعنی قانون بن گیا) ایک نادر موقع ہندو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم یک جہتی اور اتحاد کا پیدا کر دیا اور مہاتما گاندھی نے اہل وطن کے عزم و ارادے کے اظہار کے لیئے ستیاگرہ کے پروگرام کا اعلان کر دیا ۔ اس کے مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال، فاقہ کشی اور دعا کے لیئے وقف کیا گیا، بعد میں اسے ٦ اپریل پر موٴخر کر دیا گیا ۔ مگر دلی میں یہ دن ۳۰ مارچ کو ہی منایا گیا اور پولیس تشدد کی وجہ سے کچھ جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیا گیا ۔ ٦ اپریل کو لاہور، امرتسر اور احمدآباد میں کچھ ہنگامے ہوئے جن میں کچھ انگریز بھی مارے گئے ۔ ۱۰ اپریل کو جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا جہاں جنرل ڈائر کے حکم پر ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے ایک جلسے کو خون میں نہلا دیا گیا ۔ باقی ملک میں ہڑتال خیر و عافیت سے گزر گئی ۔ گاندھی کا ستیاگرہ عدم تشدد پر مبنی تھا مگر اس موقع پر سینکڑوں افراد خاک و خون میں مل گئے ۔ چنانچہ گاندھی نے سول نافرمانی کو اپنی "ہمالہ برابر غلطی" قرار دے کر معطل کر دیا ۔ مگر پنجاب اور سرحد میں مارشل لاء نافذ ہو گیا تھا اور ظلم و ستم کی جو کسر جلیانوالہ باغ میں باقی رہ گئی تھی اسے یہاں کے نہتے عوام پر آزمایا گیا اور بعض علاقوں میں تو انسانوں کو پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا ۔ یہ دور وحشت و بربریت بیسویں صدی کے ترقی یافتہ زمانے میں ایک "مہذب قوم" کے لیئے ایک ایسا تمغہ بن گیا جسے اپنے سینے پر سجانے سے برطانوی قوم بھی شرمانے لگی تھی ۔ مگر چونکہ تازہ تازہ فتح کے نشے میں سرشار تھی اس لیئے اس کے استعماری تکبر اور غرور میں کوئی فرق نہ آیا ۔ مگر جنوبی ایشیا کے لیئے یہ قربانی ایک نئے روشن عہد کی تمہید بن گئی ۔ مسلمانوں کا جوش و جذبہ دو چند تھا ۔ ملکی آزادی و خود مختاری کے علاوہ خلافت کی بقاء اور تحفظ کے لیئے وہ سینہ سپر ہو رہے تھے ۔ خلافت کمیٹی قائم ہو چکی تھی اور اس کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دلی میں ہوا جس میں گاندھی بھی شریک ہوئے اور انہوں نے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی ۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس ایک ساتھ ہوئے ۔ علی برادران (محمد علی، شوکت علی) بھی چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے ۔ ابوالکلام آزاد بھی جنوری ۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی سے چھوٹ کر کلکتہ آئے اور وہاں فروری ۱۹۲۰ء میں پہلی خلافت کانفرنس کی صدارت کی ۔ مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد یورپ بھیجا گیا تاکہ اتحادیوں خصوصا برطانیہ سے خلافت کی بقاء کے لیئے اہتمام حجت کا فریضہ انجام دیا جا سکے ۔ معاہدہ سیورے Treaty

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

of Sevres طے ہو چکا تھا اور ابھی اس پر دستخط ہونے باقی تھے جب یہ وفد یورپ پہنچا۔ خلافت کے سلسلے میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی آئندہ جدوجہد کا انحصار اس معاہدے کی شرائط پر ہوتا تھا۔ اس امید و بیم کے عالم میں انتظار ہو رہا تھا۔

یہاں تحریک خلافت کا جائزہ لینا یا ترک موالات کی تفصیلات پیش کرنا مقصود نہیں۔ ہم صرف ان امور کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں گے جو اجتماعی ہجرت کے واقعہ پر منتج ہوئے اور اس کے مثبت یا منفی اثرات کا جائزہ لیں گے۔

خلافت کمیٹی اپنے پہلے اجلاس منعقدہ دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء میں آئندہ جدوجہد کے سلسلے میں جملہ اختیارات مہاتما گاندھی کو تفویض کر چکی تھی گاندھی جی نے "ینگ انڈیا" (مورخہ ۵ مئی ۱۹۲۰ء) میں چار مرحلوں پر مبنی ترک موالات کا پروگرام پیش کیا، جو یہ تھا۔

۱۔ خطابات اور اعزازی عہدوں کا ترک کرنا۔
۲۔ سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی۔
۳۔ پولیس اور فوج سے علیحدگی۔
۴۔ ٹیکسوں کی ادائیگی روک دینا۔

۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کا اعلان ہو گیا۔ شرائط کی تلخیص و ترجمہ درج ذیل ہے۔

۱۔ دردانیال اور تمام دیگر درے بین الاقوامی کنٹرول میں دے دیئے گئے۔
۲۔ سلطان بحیثیت خلیفۃ المسلمین باسفورس کے کنارے (قسطنطنیہ) میں اتحادیوں کی نگرانی میں رہے گا۔
۳۔ جنوبی اناطولیہ فرانس کو ملے گا۔
۴۔ ادالیہ (٦) کا صوبہ اطالیہ کے حوالے کیا گیا۔
۵۔ سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کے حوالے ہوا۔
٦۔ سمندری راستوں سے منقطع کر کے ترکوں کو وسطی اناطولیہ دیا گیا۔
۷۔ عرب صوبے (شام، عراق، فلسطین، اردن وغیرہ) انگلستان اور فرانس کے انتداب میں دے دئے گئے۔
۸۔ آرمینیوں کے لئے ایک نئی ری پبلک وجود میں لائی گئی جو اناطولیہ کے مشرقی صوبوں اور بحر اسود کے کنارے واقع ہوگی۔
۹۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے (اعلان بالفور کے ذریعے) یہودیوں کی انجمن سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسطین میں وطن یہود دینے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق طے ہوا کہ یہودیوں کو فلسطین میں وطن دیا جائے۔

۱۰۔ ترکی کی سرحد اسی طرح رہے گی جس طرح کہ اس وقت حد بندی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ کمیشن جو حد بندی کے لئے مقرر کیا جانے والا ہے وہ حسب ضرورت اس میں ترمیم کرسکتا ہے۔ اس کے مطابق ترکی میں تھریس کا حلقہ، قسطنطنیہ کا علاقہ اور ایشیائے کوچک کے وہ تمام علاقے شامل ہوں گے جن میں ترکوں کی آبادی کی اکثریت ہے۔

۱۱۔ قسطنطنیہ میں ترکی حقوق و اختیارات میں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ترکوں نے اس عہدنامے کی شرائط کو ایمانداری سے پورا نہ کیا تو اتحادیوں کو ان شرائط میں ترمیم کرنے کا اختیار ہوگا۔

۱۲۔ وہ تمام سمندری علاقے جو بحیرہ روم سے دردانیال (Dardanelles) کے دہانہ اور بحیرہ اسود سے باسفورس کے جنوبی علاقے کے درمیان واقع ہیں، کمیشن کے زیر اقتدار رہیں گے اور ان حدود سے ترکی بے تعلق رہے گا۔

معاہدہ سیورے عثمانی سلطنت کے خاتمے کا پروانہ تھا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکان احرار کی مزاحمت زور پکڑ رہی تھی اور جہاد آزادی کا سامان فراہم ہورہا تھا۔ ادھر جنوبی ایشیا کے مسلمان بھی تحریک خلافت کے پرچم تلے اپنے ترک بھائیوں کی مدد کے لئے کمر باندھ رہے تھے۔ مئی ۱۹۲۰ء میں ہی ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور کانگرس کی پنجاب کمیٹی کی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔ ان رپورٹوں کی اشاعت سے بھی سارے ملک میں اشتعال پھیل گیا۔ گاندھی "ینگ انڈیا" میں ترک موالات کا پروگرام پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ اس پروگرام کو سب سے پہلے خلافت کمیٹی نے اپنے بمبئی کے اجلاس (۲۸ مئی ۱۹۲۰ء) میں منظور کیا۔ ۳۰ مئی کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں طے پایا کہ ترک موالات کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے کانگرس کا ایک خصوصی اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہوگا۔ لیکن گاندھی اور ان کی قیادت میں خلافت کمیٹی اس اجلاس سے پہلے ہی حرکت میں آنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ یکم جون ۱۹۲۰ء کو گاندھی نے ترک موالات کے سلسلے میں ہندو مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں مسز اینی بیسنٹ، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر سپرو، موتی لال نہرو، چنتا منی وغیرہ ہندو رہنما موجود تھے۔ ان میں اکثر رہنماؤں نے ترک موالات کی حکمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عملی پر اعتراضات کیئے جو رد کر دیے گئے ۔ ۹ جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں حکومت کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ ہوا ۔ ۱۳ جون ۱۹۲۰ء کو بنارس میں کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا اور خلافت کمیٹی سے کہا گیا کہ وہ مجلس ترک موالات کے نام سے ایک انتظامی مجلس بنانے اور ایک مفصل پروگرام بنا کر اس پر عملدرآمد کرائے ۔ اعتدال پسند رہنماؤں کی آراء سے بے نیاز ہو کر گاندھی اور خلافت کمیٹی کے مسلمان رہنماؤں نے ۲۲ جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد کے تصفیے کے مطابق منشور جاری کیا کہ اگر یکم اگست سے پہلے تک پیش کردہ شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو اس روز سے ترک موالات شروع کر دیا جائے گا ۔ اسی روز گاندھی نے اپنی خدمات سرکار کا حوالہ دیتے ہوئے وائسرائے سے اپیل کی کہ وہ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق طے کرا دیں ، ابھی وقت ہے ۔ ورنہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے تین راستے باقی ہیں ۔ ۱ ۔ جہاد ، ۲ ۔ ہجرت ، ۳ ۔ ترک موالات ۔ " میں نے مسلمانوں کو ترک موالات کا مشورہ دیا ہے ۔ " ترک موالات کا مشورہ دے کر گاندھی نے ۷ جولائی ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی کی مجلس ترک موالات کی طرف سے عدم تعاون کے پہلے مرحلے کے لیئے یہ تجاویز پیش کیں ۔

۱ ۔ خطابات اور عہدوں سے دست برداری ۔

۲ ۔ سرکاری قرضوں میں عدم شرکت ۔

۳ ۔ قانون پیشہ اصحاب کا اپنی وکالت ترک کر دینا اور نجی پنچائتوں کے ذریعے سول تنازعات کا تصفیہ کرنا ۔

۴ ۔ طلبہ کے والدین کا سرکاری مدارس کا مقاطعہ کرنا ۔

۵ ۔ کونسلوں یعنی مجالس وضع قوانین و اصلاحات کا مقاطعہ کرنا ۔

۶ ۔ سرکاری پارٹیوں اور دیگر تقریبات میں شرکت نہ کرنا ۔

۷ ۔ میسوپوٹیمیا اور کسی قدیم ترکی عملداری میں حکومت کی فوجی یا سول ملازمتوں سے انکار کرنا ۔

۸ ۔ بدیسی کپڑوں کا مقاطعہ اور سودیشی کا پراپیگنڈہ کرنا ۔

ترک موالات کا یہ پروگرام دے کر خلافت کمیٹی نے گاندھی کی رہنمائی میں ملک بھر میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں ۔ جولائی کا مہینہ گزر گیا ۔ وائسرائے کی طرف سے کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا ۔ آخر یکم اگست ۱۹۲۰ء کو ترک موالات کی مہم کا آغاز کر دیا گیا ۔ مہاتما گاندھی نے اپنے وہ تمام تمغے اور امتیازات جو انہیں جنوبی افریقہ میں جنگی خدمات کے صلے میں ملے تھے ، واپس کر دیئے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک کے طول و عرض میں یکم اگست کو ہڑتال ہوئی ۔ بے شمار جلسے ہوئے ۔ قربانی دینے کے عہد و پیمان کئے گئے ۔ یہ جنوبی ایشیا کی بیداری کا دن تھا ۔ اور مسلمان اسمیں پیش پیش تھے ۔ گاندھی کی معیت میں علی برادران ملک بھر میں پرجوش تقریریں کر کے عوام میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر رہے تھے ۔ کانگرس کے خصوصی اجلاس کلکتہ نے بھی ستمبر ۱۹۲۰ء میں آنجہانی سی ۔ آر داس اور دیگر بعض قانون دان رہنماؤں کے اختلاف رائے کے باوجود ترک موالات کے پروگرام کو حصول سوراج کے اضافے کے ساتھ منظور کر لیا ۔ اس دوران میں ہزاروں لوگ جیلوں میں چلے گئے ۔ ہزاروں مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے ۔ کونسلوں کے مقاطعے کی مہم بھی کامیاب رہی ۔ البتہ عدالتوں اور سرکاری تعلیم گاہوں کا مقاطعہ جزوی تھا (۷) ۔

اس میں قابل غور معاملہ مسلمانوں کی ہجرت افغانستان کا ہے جس کا ذکر متذکرہ بالا تجاویز میں کہیں نظر نہیں آتا اور پھر سندھ، پنجاب اور سرحد سے ہجرت کا یہ سلسلہ یکم اگست ۱۹۲۰ء (ترک موالات کے آغاز کا دن) سے بھی پہلے شروع ہو گیا ۔ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور چونکہ "آزادی کی تلاش" کے مصنف میاں اکبر شاہ صاحب کی سرگذشت کا تعلق بھی تحریک ہجرت ہی سے ہے، اس لئے اس پروگرام کی ذمہ داری کا تعین بہت ضروری ہے ۔ ہم پہلے افغانستان میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کی الم انگیز صورت حال کے بارے میں چند مستند بیانات پیش کرتے ہیں ۔

ظفر حسن ایبک جنہوں نے طلباء لاہور کے ساتھ پانچ سال پہلے (فروری ۱۹۱۵ء) ہجرت برائے جہاد کی تھی اور اس ہجرت عام کے موقع پر کابل میں موجود تھے، اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں ۔

> صوبہ یو ۔ پی کے مولانا عبدالباری مرحوم نے ہندوستان کو، علمائے دیوبند کی طرح دارالحرب قرار دے کر فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالسلام میں چلے جائیں ۔ اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ لیکن ہجرت کر کے کہاں جائیں اور کس ملک میں پناہ لیں؟ اس بارے میں ان کو تردد تھا اس پر امیر افغانستان اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے یہ الفاظ خاص کر قابل ذکر ہیں " افغانستان بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد (یعنی افغانستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سارے کا سارا ملک ہندوستانی مہاجرین کو پناہ دینے پر تیار ہے ۔) اس قسم کے بیانات کو قبلہ مولانا (عبیداللہ سندھی) صاحب مرحوم نے کچھ پسند نہ کیا ۔ لیکن ان پر اعتراض بھی نہ کیا ۔ امیر صاحب کے ان بیانات کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانان ہند کے لئے زبانی ہمدردی کریں اور اس سے ذرا انگریزوں کو ڈرا کر ، افغانستان کے لئے کچھ رعایات لے لیں ۔ ورنہ نہ تو ان بیچارے مہاجروں کے کسی جگہ بسانے اور نہ ہی ان کو باقاعدہ مدد دینے کے لئے کوئی انتظام کیا گیا تھا اور نہ اس بارے میں کوئی اچھی سوچی ہوئی پلان موجود تھی ۔ یہ بیانات توفوری جذبات کی وجہ سے دیے گئے تھے ۔

افغانستان میں اس بارے میں جتنی کوتاہ اندیشی ہوئی ، اتنی ہی بد انتظامی ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئی ۔ کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا کہ امیر صاحب کے ان بیانات کے بعد کابل میں کسی کو خط لکھ کر ، یا ایک آدمی بھیج کر معلوم کریں کہ ان مہاجروں کی پذیرائی اور ان کے بسنے کے لئے کیا انتظامات کیئے گئے ہیں ۔ نہ ہی کسی کی عقل میں یہ بات آئی کہ ان مہاجروں کو چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل میں اور چند چند روز کے فاصلے سے بھیجا جائے تاکہ ایک قافلے کے رہنے کا اچھی طرح کا انتظام ہو جانے کے بعد دوسرا قافلہ روانہ کیا جائے ۔ ہجرت کے فتوے پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دیئے اور نتیجہ اور عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے ۔ ان بیچاروں کے اس جوش میں نہ صرف ان کی مذہب دوستی کا دخل تھا بلکہ ایک حد تک ان کی مالی خرابی کا بھی اثر تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں ان کے لئے سرکاری خزانے کا منہ کھلا ہوا ہے ، جہاں وہ جاتے ہی مالدار ہو جائیں گے ۔ حالانکہ اس کا امکان نہ تھا ۔ کیونکہ افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے اور پسماندہ ہے ۔ یہاں ہزاروں مہاجروں کا جلد اور بہ آسانی بس جانا ناممکن ہے ۔ افغانستان میں قابل کاشت زمین اتنی کم ہے کہ وہ اپنے پیوندوں کو جو سردی کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں برصغیر ہندو پاکستان کو جایا کرتے ہیں ، زمینوں اور کھیتوں پر آباد کرنے سے عاجز ہے

مہاجروں کا جم غفیر بے سروسامانی کی حالت میں افغانستان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف روانہ ہوا ۔ اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم تھے ۔ چند ایک ہائی اسکول پاس شدہ اور شاید چار پانچ گریجویٹ تھے جن میں لاہور سے اقبال شیدائی ، پشاور سے اکبر خان اور احمد شاہ خان ، بھوپال سے مسٹر عثمانی شامل تھے ۔ انگریزوں نے جن کو افغانستان کی مالی کمزوری اور ہندوستانی تحریک ہجرت کی بے سروسامانی کا خوب علم تھا ، اس تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ ان کے کارندوں نے ہندوستان میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ کابل پہنچتے ہی مالدار ہو جائیں گے ۔گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہجرت کی ترغیب دی اور اس طرح پر اس تحریک کو افغانستان اور پنجابی اور سرحدی مسلمانوں کے لئے ایک رحمت کی بجائے ایک آفت بنا دیا ۔ امیر صاحب کو امید تھی کہ ہماری جماعت کی طرح کے لکھے پڑھے ہندوستانی اس تحریک کے ذریعے افغانستان آئیں گے لیکن یہاں تو یہ ہوا کہ جتنے ان پڑھ کاشتکار تھے ، جن کے لئے ہندوستان میں ساہوکاروں ، زمینداروں اور گورنمنٹ کے مطالبات کی وجہ سے زندگی تنگ ہو چکی تھی ، اس تحریک میں شریک ہوئے ۔ اکثر تو پیدل آئے ۔ جنہوں نے اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا ، انہوں نے اپنی بیل گاڑیوں پر سامان لاد کر ان کو ان پر سوار کیا ، یا کرایہ پر گاڑیاں لیں ۔ بعض کو امید تھی کہ افغانی سرحد میں داخل ہوتے ہی ان کے لئے سواری کا انتظام ہو جائے گا لیکن افغانستان میں نہ زیادہ گھوڑے گاڑیاں ہیں اور نہ تانگے ہیں ۔ صرف جلال آباد میں چند ایک تانگے کرایہ پر مل سکتے تھے ۔ یہ مہاجر افغانی سرحد سے جلال آباد تک بہت بے سرو وسامانی سے پہنچے ۔ جلال آباد میں ان میں سے بعضوں نے کچھ سواری اور بار برداری کا سامان کیا ۔ لیکن ان گاڑیوں کے گھوڑے ان کو راستے کی پہاڑیوں پر سے گزار کر کابل تک نہ پہنچا سکے ۔ پہلے قافلے کے بعد جو قافلے آئے ، ان کو تو بار برداری بالکل مل ہی نہ سکی ۔ جو اپنی گاڑیاں لائے تھے ، ان کے بیلوں کو چارہ نہ مل سکا ۔ ان مہاجروں کے کھانے پینے کا انتظام بھی بہت مشکل تھا ۔ جلال آباد میں کوئی ہوٹل تھا نہ ریستوران ۔کھانے کی چند ایک دوکانیں تھیں جن میں کھانا بہت نکما اور زیاد مقدار میں بھی موجود نہ ہوتا تھا ۔ اسلئے ان بیچاروں کو اپنے پیسے سے بھی روٹی نہ مل سکی ۔ جلال آباد میں سردار سپہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سالار (نادر خان) صاحب مرحوم نے حکومت سے منظوری لے کر ان کو روٹی کھانا دیا ۔ لیکن ان کے ہاتھ میں بھی کافی روپیہ نہ تھا اور نہ پورا انتظام ، اور نہ ہی ایسے ذرائع موجود تھے کہ ہزاروں اشخاص کی ایک دم ضروریات پورا کریں ۔ میں نے جلال آباد میں ان لوگوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی جو افغانی گورنمنٹ کی مدد کے باوجود بھی پریشان تھے ۔ اس افراتفری کا مجھ پر بہت اثر ہوا ۔ میں نے مولانا عبدالباری کو خط لکھے کہ اس سیلاب کو روکیں اور صرف پڑھے لکھے لوگوں کو جو افغانستان کے لئے مفید ثابت ہو سکیں ، بھیجیں لیکن وہاں تو محشر برپا تھا ، میری یا کسی اور کی کون سنتا تھا !

قافلے پے درپے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے ۔ شروع میں ان کو خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی ۔ لیکن ان سب کے لئے قابل اطمینان انتظام ناممکن تھا ۔ بے چاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں ۔ بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی بھی کی ۔ بعض لوگوں نے تو روٹی اور کھانا خریدنے کے لئے اپنا اثاث البیت بھی فروخت کرنا شروع کر دیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا ان لوگوں کا فارسی زبان سے بے بہرہ ہونا ، ان کی بے مائیگی ، پردیس اور اس پر وفادار دوستوں کا فقدان ، یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو خود دیکھا اور ان کا سامنا کیا ہو ۔

آخر جب مہاجرین کی تعداد بڑھنے لگی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبوں مثلاً پنج شیر ، قطغن ، بدخشاں اور ترکستان کو روانہ کیا گیا ۔ پہاڑی راستہ ، ان کی خود بے سروسامانی ، پڑاؤں پر کھانے پینے کی چیزوں کا نہ ملنا ، ایسی مشکلات تھیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن تھا ۔ صرف چند ایک نوجوان ترکستان پہنچے اور وہ وہاں سے تاشقند چلے گئے ۔ کچھ قطغن اور بدخشاں میں آباد ہوئے ، مگر وہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے پنپ نہ سکے ۔ باقی پھر کابل کی طرف واپس لوٹے اور وہاں سے ہندوستان واپس جانے پر تیار ہو گئے ۔ اس پر کابل میں ٹھہرے ہوئے مہاجر بھی پشاور کو لوٹنے لگے ۔ اب یہ سیلاب الٹا پھرا اور ہندوستان کی طرف مڑا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے ۔ افغانستان پر مالی بوجھ پڑا ۔ ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے کبیدہ خاطر بنے ۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے ۔ ہجرت کی تحریک کو بذات خود ایک اچھی تحریک تھی ، لیکن بد انتظامی ، بے سرو سامانی اور بغیر سوجھے بوجھے چلائے جانے کی وجہ سے مفید ہونے کی بجائے بہت مضر ثابت ہوئی ۔ اگر مسلمان مکے کی ہجرت سے سبق لیتے تو یہ مفید ہوتی (۸) ۔

ظفر حسن ایبک کا یہ بیان حقائق پر مبنی ہے ۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے مشاہدات کو بڑی احتیاط سے قلم بند کیا ہے اور بڑے ٹھوس انداز میں ان کا تجزیہ پیش کیا ہے ۔ ان کو یہ مواقع بھی حاصل تھے کہ وہ مستند معلومات حاصل کر سکیں ۔ کیونکہ جنگ استقلال میں وہ سپہ سالار نادر خان کا اعتماد حاصل کر چکے تھے اور مجرت عام کے موقع پر وہ سپہ سالار کے ذاتی معتمد کی حیثیت سے وزارت حربیہ سے منسلک تھے ۔ اس لئے جلال آباد اور کابل میں انہوں نے مہاجرین کی زبوں حالی کے نقشے اپنی آنکھوں سے دیکھے ۔ مگر انہوں نے شروع میں تحریک ہجرت کے فتویٰ کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے منسوب کر کے ساری ذمہ داری ان پر ڈال دی ہے ۔ شاید ان تک یہ خبر اسی طرح پہنچی ہو ۔ اس خبر کی تصدیق کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا (۹) ۔

ذ ارالحرب اور د ارالسلام متنازع فیہ ہیں۔ مولانا عبد الباری کی تحریر میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔ نہ ہی انہوں نے از خود کوئی فتویٰ دیا ہے ۔ قصہ یہ تھا کہ امرتسر کے ایک صاحب غلام محمد عزیز (جو ہجرت کے بعد عزیز ہندی کے نام سے معروف ہوئے) نے وانسرائے کو اس مضمون کا تار دیا " چونکہ مذہب اسلام ہم کو اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا ، اس لئے ہم مہاجرین کا مقصد ہے کہ ہم نہایت امن کے ساتھ اس ملک کو چھوڑ دیں ۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ آپ ہمارے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں گے ۔ " اور ساتھ ہی مولانا عبدالباری سے فتویٰ طلب کیا جس کا جواب مولانا نے یہ دیا ۔

ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر ، قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے مجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق سے ممکن ہو (۱۰) ۔

اس تحریر میں نہ ہجرت کی دعوت ہے اور نہ اسے فرض واجب قرار دیا گیا ہے بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہجرت کو صرف ان لوگوں کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے جو غیر تسلی بخش حالات میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہیں، اس سے ویسی ہی انفرادی ہجرت کا جواز ملتا ہے جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دیا تھا اور جس کی ذیل میں بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی اور جہاد کی خاطر دوسرے ہجرت کرنے والے افراد آجاتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے مولانا عبدالباری نے ذیل کی تحریر اخبار "مشرق" (گورکھپور) کو بھیجی جو ۶ مئی ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں چھپی۔

فرنگی محل ۲ شعبان ۱۳۳۸ھ

مکرمی دام مجدہ، السلام علیکم

بعض حضرات نے مسائل ہجرت بذریعہ تار دریافت کئے ہیں۔ اسکا جواب دے دیا گیا۔ مگر مفصل نہیں ہے۔ اس واسطے ان کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔ امید ہے کہ شائع فرما دیجئے گا۔ ہجرت شرعاً دو طریقوں پر مستعمل ہے۔ ایک ہجرت اوصاف سے دوسری اوطان سے۔ ہجرت اوصاف سے یہ مراد ہے کہ ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے اور اوامر کا پابند ہو۔ یہ ہجرت ہمیشہ ہمیشہ تک مشروع ہے۔ دوسری ہجرت اوطان سے۔ یہ چند اقسام کی ہے۔

۱۔ ہجرت مکہ سے حبشہ کی جانب دو مرتبہ ہوئی۔ اس وقت جب کہ کوئی دارالسلام نہ تھا۔ تو دار شرک سے دار اہل کتاب کی جانب ہجرت ہوئی یا دار ظلم سے دار عدل کی جانب۔ اور اگر نجاشی کا اسلام مان لیا جائے اور اصل حکم دار بوجہ سلطان کے فرض کیا جائے تو وہ بھی ہجرت دارالسلام کی جانب ہوئی۔

۲۔ ہجرت مکہ شریف سے جو اس وقت دارالحرب تھا، مدینہ طیبہ کی جانب جو دارالسلام تھا۔ یہ ہجرت فرض تھی اور فتح مکہ کے بعد منسوخ ہو گئی۔ یعنی جو ایمان لائے وہ ہجرت کرے تب تو تمام احکام میں مسلمانوں کا شریک ہے، ورنہ نہیں۔ یہاں تک کہ توارث وغیرہ میں بھی حق نہیں ہوتا۔ امام رازی کے بیان کے مطابق یہ ہجرت اس وقت پھر فرض ہو جائے گی جب کہ مسلمانوں کی اگلی حالت لوٹ آئے اور سوائے ایک مامن کے کوئی نہ ہو۔

۳۔ ہجرت بادیہ نشین کی مدینہ طیبہ کی جانب، یہ حقوق میں مساوات حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی۔ یہ بھی منسوخ ہو گئی۔ بلکہ حکم ہو گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جہاں کوئی شخص پیدا ہوا اور اس مقام پر نماز وغیرہ ارکان اسلام ادا کر سکتا ہو تو اسکو ہجرت کی ضرورت نہیں۔

۴۔ دار فسق و ظلم سے دار عدل و تقویٰ کی جانب ہجرت۔ بلکہ اس زمین سے جہاں گناہوں کی کثرت ہو، وہ خود مرتکب ہوں یا دوسرے۔ یہ ہجرت مستحب ہے۔

۵۔ دار حرب سے دارالسلام کی جانب ہجرت مستحب ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہو جاتی ہے بلکہ توطن دار حرب میں بلا ضرورت شرعیہ حرام ہے۔ ہم لوگ ہندوستان کو دارالسلام سمجھتے ہیں اور اعزاز دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے قیام کیئے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے۔ مگر چارہ نہ ہو بجز اس کے کہ یا ہجرت کرے یا مبتلائے مصیبت رہے یا استرضا بالمعصیت کا ارتکاب ہو، یا قیام وطن سے اس قدر خدمت نہ کر سکیں جتنی کہ باہر نکل کر کر سکتے ہیں، تو ان صورتوں میں ہجرت مشروع ہے۔ موجودہ حالت میں ہندوستان سے اگر قابل و ذی استعداد لوگ کابل ہجرت کریں یا محنتی و جفاکش لوگ ترک وطن کر کے وہاں آئیں تو امید ہے کہ اسلام کو فائدہ زائد حاصل ہوگا اور اپنے وطن عزیز کی بھی خدمت کریں گے۔ احادیث سے آخر زمانہ میں شام کی جانب ہجرت کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے (۱۱)۔

آخری شق نمبر ۵ میں ہجرت زیر بحث کے سلسلے میں ایک مشورہ دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کو جو کچھ "قابل" اور "ذی استعداد" تھے اور ان کی ہجرت سے افغانستان یا وطن عزیز میں اسلام کی خدمت ہو سکتی ہو۔ مگر اسے واجب نہیں قرار دیا گیا۔ اس طرح مولانا عبدالباری کا دامن تحریک ہجرت کے سلسلے میں صاف ہو جاتا ہے اب ہم تحریک ہجرت کے اصل داعی کی طرف آتے ہیں۔

جون ۱۹۲۱ء میں جب کلکتہ سے ہفتہ وار "الہلال" شائع ہوا تو یہ محض ایک رسالہ یا اخبار ہی نہیں تھا بلکہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو رومانویت کے اندر لپٹی ہوئی دین کے حوالے سے سیاست کی ایک دعوت تھی۔ اس بلند آہنگ دعوت و ارشاد سے کوئی قائل ہوا یا نہ ہوا، مگر گھائل اکثر لوگ ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی انفرادیت و انانیت کے بلند بام سے، جو رومانوی ادیبوں کا خاصہ ہے، ملت اسلامیہ ہند کو داعیانہ شان سے خطاب کیا جسکی مثال یہاں موجود نہیں تھی۔ یہ "صور" پھونک کر وہ جنگ عظیم کے دوران رانچی میں نظر بند ہو گئے۔ جہاں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو انہیں آزادی ملی، اور وہ ایک نئی رومانوی شان سے ملت کی قیادت کے لئے میدان عمل میں نکلے۔ یہ واضح رہے کہ رومانوی ادیب ہو یا رہنما وہ اپنی انفرادیت یا انانیت کے خول سے کم ہی باہر آتا ہے۔ اس کا ذہن طبعاً جمہوریت سے زیادہ آمریت کا پروردہ ہوتا ہے، جسے اگر دینی رنگ دیا جائے تو اصطلاحاً اسے "امامت" کہہ سکتے ہیں۔ خلافت کانفرنس کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو صدر بنایا گیا۔ یہ کانفرنس ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو ہوئی۔ کانفرنس کے فوراً بعد مولانا خلافت کمیٹی کے پروگرام کے علاوہ اپنے ایک سوچے سمجھے پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس پروگرام کی تفصیل مولانا آزاد کے ایک معتمد رفیق اور مقرب مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کی زبانی سنیئے۔

مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فریضہ سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے، اگر قرآن و حدیث سے انہیں بتادیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے، اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے، تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے، اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے۔ مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لئے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا۔ ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات زمانہ سے کماحقہ، واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے، مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ انہی کو یہ منصب ملنا چاہیئے۔

اس کے بعد طے پا گیا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے لیے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دی جائے۔ تاکہ جب یہ معاملہ سامنے آئے، تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو۔ اس طرح لوگوں میں رشک و رقابت کا سدباب ہو جائے گا، اور مسلمان ایک امام پر متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔ اسکیم سے میں نے اتفاق ظاہر کیا تو مولانا نے بتایا، دوسرے صوبوں میں بیعت کا کام جاری ہو چکا ہے۔ یوپی کا صوبہ تم اپنے ذمے لے لو۔ میں راضی ہو گیا تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک تحریر دی جس میں مجھے خلیفہ مقرر کیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکھا کہ ان کے لیے بیعت لینے کا مجاز ہوں۔ تحریر حسب ذیل ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

۴ شعبان ۱۳۳۸ھ (اپریل ۱۹۲۰ء) (۱۲)

اسکے بعد مولوی عبدالرزاق نے الفاظ بیعت کا مسودہ (جو آزاد نے لکھا) نقل کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں۔

یہ مرحلہ ختم ہوا تو شائستہ پیرائے میں میری مالی حالت کے بارے میں استفسار کیا۔ یہاں اللہ کے نام کے سوا کیا تھا؟ ... اس پر مولانا نے کہا، " اس قسم کے کام انجام دینے کے لئے دلجمعی کی ضرورت ہوتی ہے، اور دلجمعی کی صورت یہ ہے کہ آدمی معیشت کی طرف سے بے فکر ہو " پھر فرمایا " ایک رقم مقرر ہو جائے گی اور ہر ماہ لکھنؤ میں پہنچتی رہے گی۔ یہ بات مجھے ناپسند ہوئی۔ فوراً سمجھ گئے، کہنے لگے " مولوی صاحب، یہ رقم میری طرف سے نہیں ہوگی۔ میں خود فقیر ہوں کسی کو کیا دوں گا۔ لیکن ایک نیک دل مسلمان نے ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں انہی کاموں کے لئے ڈال رکھی ہے۔ اسی میں سے پچاس روپے ماہوار آپ کو بھی پہنچا کریں گے۔ فی الحال لکھنؤ کو اپنا مرکز بنائیے اور پورے صوبے میں کام شروع کر دیجئے۔

(بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رقم جس کا مولانا نے حوالہ دیا تھا، مولانا عبدالقادر صاحب قصوری مرحوم کے لڑکے مولانا محمد علی ایم اے نے ایک لاکھ روپیہ کی شکل میں دی تھی، یہ صاحب بمبئی میں کاروبار کرتے تھے۔)

اس کے بعد ایک گُر کی بات سنائی۔ " لوگوں پر اثر جمانے، ان میں اپنے لئے مروت پیدا کرنے، انہیں اپنی رائے پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً دعوتیں دی جائیں۔ کبھی چائے پر بلا لیا، کبھی کھانے کا سامان کر دیا۔ آج انہیں، کل انہیں۔ اس طرح ہوتے ہوتے بہت آدمی اثر میں، آجاتے ہیں۔ دس آدمیوں کی دعوت پر جو خرچ ہوتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ دس ہزار آدمیوں کے جلسے پر خرچ ہو جاتا ہے مگر اس جلسے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک آدمی بھی قبضے میں نہیں آتا، لیکن ایک دعوت کے مختصر خرچ سے دس کے دس آدمی اپنا خیال تو ضرور کرنے لگتے ہیں۔(۱۳)

لکھنئو پہنچ کر مولوی عبدالرزاق نے یہ نسخہ آزمایا تو واقعی مولانا کی بات ٹھیک ثابت ہوئی۔ ایک دو ماہ میں سینکڑوں آدمی بیعت میں داخل ہو گئے۔ ان کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبدالباری پر بھی ڈورے ڈالے مگر دونوں بزرگ طرح دے گئے۔ مولانا محمود حسن مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر آئے تھے اور لکھنئو میں مولوی عبدالباری کے مہمان تھے۔ گفتگو میں تو ان بزرگوں نے مولانا آزاد کے امام الہند بننے سے اتفاق کیا۔ مولوی عبدالرزاق کے تحریری جواب مانگنے پر مولانا عبدالباری نے یہ تحریر لکھ کر دی۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ مسئلہ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے، وہ بارہا اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں۔ باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسر و چشم قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی، مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا، نہ آئندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب، اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے بھی مجھے استنکاف نہیں ہے۔ بسر و چشم قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں، بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں، اگر کسی نااہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کر لیں گے تو مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار و فرمانبردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا۔ نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں، اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں۔ والسلام!

بندہ فقیر محمد عبدالباری

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس خط کی نقل مولانا آزاد کو ارسال کر دی۔ مولانا آزاد نے اس خط کے متعلق صرف یہ لفظ لکھے، "مولانا عبدالباری کا خط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھا ۔ یارما ایں داردوآں نیز ہم ! سردست اس قصے کو تہہ کیجئے اور کام کئے جائیے ۔ پنجاب ، سندھ ، بنگال ، میں تنظیم قریب مکمل ہے ۔(۱۴)۔

بیعت امامت کے ساتھ ہی کچھ دنوں بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ہجرت کا فتویٰ بھی جاری کر دیا تھا ۔ فتویٰ پر کوئی تاریخ درج نہیں ۔ مولانا غلام رسول مہر نے " تبرکات آزاد " میں ہجرت کا فتویٰ ہفتہ وار " اہل حدیث " امرتسر کی اشاعت ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء سے لے کر درج کیا ہے ۔ قیاس ہے کہ یہ فتویٰ جلسہ خلافت کمیٹی ، بمبئی (۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء) اور مجلس ترک موالات کے حتمی پروگرام کی تشکیل (۷ جولائی ۱۹۲۰ء) کے درمیانی عرصے میں دیا گیا ہوگا ۔ فتویٰ کا متن یہ ہے ۔

تمام دلائل شرعیہ حالات حاضرہ ، مصالح مہمہ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد میں پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے بغیر ہجرت کے اور کوئی چارہ شرعی نہیں ۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ، ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں اور جو لوگ یکایک ہجرت نہیں کر سکتے وہ مستعد مہاجرین کی خدمت و اعانت اس طرح انجام دیں ، گویا وہ خود ہجرت کر رہے ہیں ۔ یعنی اصل عمل جو اب شرعاً درپیش ہے ، ہجرت ہے ، اس کے سوا کوئی نہیں ۔ ہندوستان سے ہجرت قبل از جنگ مستحسن تھی ۔ اب یہ امتحان شرائط شرعیہ کے ماتحت وجوب تک پہنچتا ہے ، البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمہ حق کے اعلان و تذکیر کے لئے ان کا قیام ہندوستان میں بہ مقابلہ ہجرت کے زیادہ ضروری ہے ، یا جو لوگ دیگر عذرات مقبولہ شرع کی بناء پر ہجرت نہ کر سکیں ، یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہئے ، اس کی وجہ سے تاخیر ہو ، سو بلاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں ۔ ان کو اپنی تمام قوتیں اتباع شرع کے لئے وقف کر دینی چاہئیں ۔ ایک منظم جماعت کی شرعی ہیئت پیدا کر کے زندگی بسر کرنی چاہیے اور جہاں تک عزم و نیت کا تعلق ہے ہجرت کے ولولہ و تہیہ سے خالی نہیں رہنا چاہیے ۔ ہندوستان کی ایک ایسی جماعت کا قائم ہو جانا ، موجودہ حالات کی بنا پر اصلی کام ہوگا ۔

البتہ واضح رہے کہ ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندوستان میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درپیش ہے، شرعاً اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بہ طور خود ارادہ کر لے اور نکل کھڑا ہو۔ ہجرت کے تمام اعمال تنظیم و جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لئے مطلوب و مفید ہے۔ نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات کے ساتھ کہ موجب ثمرات و برکات ہو، ہر شخص بہ طور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

جب ایک طالب عمل کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا تو اس کے لئے ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا۔ اعمال ہجرت کا جو نمونہ اسوہ حسنہ نبوت نے ہمارے لئے چھوڑا ہے، وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ پس ضروری ہے کہ جو لوگ ہجرت کریں، پہلے ہجرت پر بیعت کر لیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر (جن کی تشریح رسالہ "ہجرت" میں ملے گی)، یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ہندوستان سے بیک وقت لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب۔ ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان میں بھی اسلامی آبادی باقی رہے گی۔ پس جو لوگ ہندوستان میں ہیں، وہ جب تک ہندوستان میں رہیں، شرعاً اُن کے لئے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریق محارب سے کسی طرح کا علاقہ، محبت و الفت یا اعانت و خدمت کا رکھیں جو شخص رکھے گا، وہ حسب نص قرآنی اسلام کے دشمنوں میں محسوب ہو گا۔ ومن یتولھم منکم فانہٗ منھم۔

"علاقہ محبت و خدمت" میں نے "موالات" کا ترجمہ کیا ہے جو قرآن میں وارد ہے۔ موالات میں وہ باتیں داخل ہیں، جن سے "خلافت کمیٹی" نان کوآپریشن" کے نام سے روکتی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ اعلان جنگ ٹرکی کے وقت سے مسلمانوں کے لئے وہ تمام باتیں ازروئے شرع ممنوع ہو چکی ہیں۔ گذشتہ فروری کے جلسہ سے دہلی سے لے کر ۱۱ اپریل کے جلسہ خلافت کمیٹی، بمبئی تک میں نان کوآپریشن کو منظور و مقبول کرانے کی جس قدر کوشش کی، حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا گیا، اس کی بنا یہی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اسلامی مطالبات کی عدم منظوری کے بعد بطور ایک دفاعی عمل کے اس تجویز پر عمل کیا جائے گا۔ کیونکہ شرعاً نہ تو یہ دفاع و جہاد ہے نہ کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستقل عمل ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وقاع کے مقدمات میں داخل ہے ۔ مسلمانوں کو ترک موالات اول روز ہی سے کرنا تھا ۔ نہ کیا تو یہ اشد شدید معصیت اور نفاق قطعی ۔ اب جب بھی کریں اور جس قدر بھی کریں ، عین مطلوب و مقصود ۔ چنانچہ دہلی کی سب سے پہلی نان کوآپریشن سب کمیٹی کے بعد ہی میں نے میرٹھ خلافت کانفرنس میں بہ تفصیل واضح کر دیا تھا کہ ہمارا مقصود اس سے کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ کام کیوں اور کس شکل میں انجام دینا چاہیئے ۔

یہ میری رائے ہے ، میری بصیرت ہے ، میرا یقین و ایمان ہے ، نہ کوئی قیاس ، رائے اور پولیٹیکل حکمت عملی ۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا ۔ بغداد و شام جا چکے ، لیکن ایمان باقی ہے ۔ اب ہم کو قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے اور مقصود بقاء ملک نہیں ہے بلکہ صرف بقاء ایمان ۔

اگر قسطنطنیہ و بغداد کو نہیں بچا سکتے تو کم از کم اپنا ایمان تو بچا لے جائیں ۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے اور پورے اطمینان و انشراح قلب کے ساتھ اس مسلک پر مستقیم ہوں ۔ جس طالب حق کو مجھ پر اعتماد ہو ، اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے ، فبشر عبادی الذین یستمعونؑ القول فیتبعون احسنہ اولائک الذین ھداھم اللہ اولائک ھم اولوالالباب ۔ بالفعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالی توفیق عمل دے وہ فورا مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کر لیں ۔

۱۔ مولوی عبدالقادر صاحب ، وکیل ، قصور (ضلع لاہور)
۲۔ مولوی محی الدین احمد صاحب بی اے ، قصور (ضلع لاہور)
۳۔ مولانا داؤد صاحب غزنوی (امرتسر)
۴۔ مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ، ایڈیٹر " البیان " (لکھنؤ)

رسالہ " ہجرت " زیر تحریر ہے ، عنقریب شائع ہوگا ۔ جن حضرات کو دلائل شرعیہ کی نسبت تامل ہو ، وہ اس کا انتظار کریں ۔

فقیر احمد (۱۵)

متذکرہ بالا اصحاب مولانا آزاد کی امامت کے لئے بیعت پر مامور تھے ۔ یعنی بیعت امامت اور بیعت ہجرت دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا تھا ۔ خلافت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کانفرنس کلکتہ (۲۸ فروری ۱۹۲۰ء) کی صدارت سے لے کر دھلی اور میرٹھ میں خلافت کمیٹی کے جلسوں تک (۱۸ اپریل، ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء) ترک موالات کا پروگرام بنا اور مولانا آزاد ان تمام جلسوں میں بہ نفس نفیس موجود اور پروگرام بنانے میں پیش پیش تھے (بقول خود) ظاہر ہے کہ ہجرت اور ترک موالات دو متضاد باتیں ہیں۔ کیونکہ ہجرت کا مطلب ترک وطن ہے اور ترک موالات تو وہی شخص کرے گا جو وطن میں رہ کر حکومت سے عدم تعاون کرے گا۔ مولانا نے ہجرت کے وجوب کا فتویٰ دینے کے ساتھ ہی اس میں استثنیٰ کا ذکر بھی کیا ہے "البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد میں ... الخ" اور اس طرح انہوں نے ہجرت اور ترک موالات میں ایک طرح کی تطبیق پیدا کر دی اور ہجرت کو بیعت امامت سے مشروط کر کے اس میں تنظیم کی بھی صورت نکالی۔ چونکہ امامت کا شعبہ ان کا الگ چل رہا تھا، اس لئے ہجرت کے مسئلے کو خلافت کمیٹی میں اٹھانے کی انہوں نے ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مگر بیعت ہجرت پر کہاں تک عمل ہوا، یہ کہنا موجودہ حالات میں بہت مشکل ہے۔ اگرچہ جن علاقوں سے لوگوں نے زیادہ تر ہجرت کی، وہ سندھ، پنجاب اور سرحد تھے (بنگال اور یو پی سے غالباً کسی نے ہجرت نہیں کی) اور یہی وہ علاقے ہیں جن کے بارے میں مولانا آزاد جا بجا بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ ان علاقوں میں بیعت امامت کا کام بہت تسلی بخش طور پر ہو رہا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان صوبوں میں مولانا آزاد کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد قیام پاکستان تک موجود تھی، (اور شاید اب بھی ہو) اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت کی تحریک میں مولانا آزاد کا فتویٰ بہت اہم محرک تھا مگر اس کے لئے کتنے لوگوں نے باقاعدہ بیعت کی؟ اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت کمیٹی کا تحریک ہجرت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گاندھی نے وائسرائے کے نام الٹی میٹم کا مکتوب بھیجتے ہوئے اس میں صراحت کر دی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے جہاد، ہجرت اور ترک موالات میں سے آخری صورت کو ترجیح دی ہے۔ خلافت کمیٹی کے دوسرے رہنماؤں کے بیانات بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ قاضی محمد عدیل عباسی نے اپنی تالیف میں خلافت ورکرز کانفرنس دھلی (مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۲۰ء) زیر صدارت مولانا حسرت موہانی کے ضمن میں مولانا احمد سعید کی تقریر کے یہ الفاظ درج کئے ہیں۔ "خلافت کمیٹی نہ مسلمانوں سے ہجرت کو کہتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے نہ جہاد کو ۔ وہ چاہتی ہے کہ گورنمنٹ کے ساتھ عدم اشتراک عمل کے اصول کام میں لانے جائیں اور سودیشی کی تحریک کی ترقی کی کوشش کی جانے ۔ "(١٦)

لاہور میں میلہ چراغاں کے موقع پر (۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء) مسلمانوں کے ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے بھی یہی بات اس انداز میں کہی ۔

جہاد ہر وقت فرض ہے اور ہر اس وقت جب اسلام پر کوئی طاقت حملہ آور ہو اور مذہبی جنگ ہو ۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد کے لئے تیار رہیں ۔ لیکن جہاد کے مختلف طریقے ہیں ۔ اگر آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ جہاد بالسیف ہے ۔ اگر آپ کے پاس تلوار نہیں ، توپ ، بندوق ، جنگی جہاز اور پورا پورا سامان نہیں ہے تو اس حالت میں ہمارا مذہبی فرض کیا ہے ؟ ایسی حالت میں اگر اعلان کر دیا جائے کہ مسلمانو ! اٹھو اور انگریزوں کو مار ڈالو ۔ آپ نے اگر ایک دو درجن انگریز مار ڈالے تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا ۔ ایک ہوائی جہاز آپ کے لئے کافی ہے ۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام آپ کو معلوم ہے ۔ ایسی حالت میں مذہب آپ کو تلوار سے جہاد کرنے پر مجبور نہیں کرتا ۔

(رہا ہجرت کا سوال ؟) اپنے بال بچوں سمیت ، تن تنہا یا سامان سمیت کسی دوسرے ملک کو چلے جائیں ۔ ہمارے پاس جہاز اور وسائل نہیں ۔ سات آٹھ کروڑ کی آبادی کہاں جا سکتی ہے ؟ یہ بھی ناممکن العمل ہے ۔ پھر باقی کیا رہ گیا ؟ دونوں سے زبردست طاقت جس کے ذریعے سے آپ ایک ماہ کے اندر ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں (۱) تمام خطابات گورنمنٹ کو واپس کر دیے جائیں (۲) فوج اور پولیس کی ملازمت ترک کر دیں (۳) ٹیکس مالیہ محصول وغیرہ کی ادائیگی سے انکار (١٧) ۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا خصوصی اجلاس لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ہوا جس میں تحریک خلافت اور حصول سواراج کے لئے ترک موالات کا پروگرام کانگرس نے بھی بہت بحث مباحثے کے بعد منظور کر لیا ۔ یہ مہاتما گاندھی کی بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی ۔ کیونکہ اس سے پہلے کانگرس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کانگرس میں گاندھی کو قیادت کا شرف حاصل تھا ۔ یہیں وہ موڑ بھی آتا ہے جب مولانا آزاد کی دعوت دین و سیاست کا وہ دور اختتام کو پہنچتا ہے جو " الہلال " سے شروع ہوا تھا ، اور ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"سیکولر نیشنلسٹ سیاست" کا دور شروع ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر بیعت امامت کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور ہجرت کا نام بھی ان کی زبان پر پھر نہیں آتا ۔ اکثر لوگوں نے اس تبدیلی رجحان پر قیاس آرائیاں کی ہیں مگر آزاد نے اس بارے میں سکوت ہی کو مناسب سمجھا ۔ ان کا والٹیر اور روسو بننے کا خواب پریشان ہو گیا تھا ۔ اسے مولانا آزاد کی شکست آرزو کا موڑ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اب وہ صرف ایک سیاسی رہنما تھے ، گاندھی کے پیرو اور کانگرس کے وفادار ساتھی ، یہی ان کے دوسرے دور حیات کی متاع گراں مایہ ہے ع

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

امامت کا منصوبہ ترک کرنے کی ایک بڑی وجہ قاضی محمد عدیل عباسی نے یہ بتائی ہے کہ

مولانا محمد علی نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے ۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور مولانا کی امامت ہی کے نہیں خود مولانا کی ذات کے سخت مخالف تھے ۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی ۔ قدرتی طور پر مولانا نے جو از حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے محسوس کر لیا کہ علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا ۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی برادران کے ساتھ تھا ۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا اور گو شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرف دار نہ تھا ۔ اس صورت میں مسئلہ امامت کا آخر تک پہنچانا دانشمندی کے خلاف تھا (۱۸) ۔

بیعت امامت کے ساتھ ہی بیعت ہجرت بھی ختم ہوئی ۔ اسکی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہجرت کا سلسلہ یکم اگست سے بہت پہلے مئی ، جون ۱۹۲۰ء سے شروع ہو گیا تھا ۔ پہلے چھوٹے چھوٹے قافلے ، پھر ہزاروں کی تعداد میں لوگ افغانستان پہنچنا شروع ہو گئے ، جہاں مصائب کے کوہ گراں ان کے استقبال کو موجود تھے ۔ شروع شروع میں تو جوش و خروش کے عالم میں یہ آلام و مصائب برداشت ہوتے رہے ۔ پھر انہی دنوں انگریزوں اور امیر افغانستان کے مابین مستقل معاہدہ صلح طے پا گیا اور مہاجرین کے لئے افغانستان کا قیام اور بھی مشکل ہو گیا ۔ اب ان مہاجروں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا ۔ قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی آیا ہو گا کہ جن علمائے کرام نے ہندوستان میں بیٹھ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہجرت کے فتوے دینے ان میں سے تو کسی کو " دارالحرب " سے ہجرت کر کے " دارالسلام " جانے کی توفیق بھی نہ ہوئی ۔ ہیجان و اضطراب کے عالم میں کون تحقیق کرتا پھرے کہ ہجرت کا فتویٰ کس نے دیا ، کس نے نہیں دیا ۔ اس تلخ رد عمل کا احساس بھی سکوت کا ایک سبب کہا جاسکتا ہے ۔

اور پھر کلکتہ کانگرس کے خصوصی اجلاس نے خلافت کے علاوہ سوراج کو بھی مقاصد میں شامل کر کے ترک موالات کا پروگرام منظور کیا تھا اور اس کی توثیق ناگپور کانگرس کے اجلاس (دسمبر ۱۹۲۰ء) میں کر دی گئی تھی ۔ اندریں حالات جدوجہد کا سلسلہ ملک کے باہر نہیں بلکہ اندر شروع ہو گیا ۔ علی برادران کراچی کے مقدمہ بغاوت میں پابند سلاسل ہو کر زنداں میں پہنچ چکے تھے اور ہزاروں لوگ قید و بند اور دار و رسن کی راہوں پر چل پڑے تھے ۔ اس لئے ہجرت کی بجائے اب مولانا ابوالکلام کا مؤقف بھی یہ ہو گیا تھا جس کا اظہار وہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں آگرہ کی خلافت کانفرنس میں کرتے ہیں ۔

اصلی میدان ، ہندوستان کا میدان تھا ۔ اندرونی میدان تھا ۔ اصلی فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا ۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں ، ترک موالات کے میدان میں ، قربانی کے ولولے کے میدان میں ۔ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے ، تو دنیا کی کون سی قوت ہے جو آپ کو شکست دے سکتی تھی ؟ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں ، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں ، تو بھی ایمان کو ایک منٹ کے لئے بھی شکست نہیں دے سکتیں ۔ سب سے بڑی ضرورت اسی بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کر لیں ۔ ایمان کے میدان کو ، استقامت کے میدان کو ، قربانیوں کے میدان کو ، ملک کے اتفاق کے میدان کو سر کر لیں ۔ جب تک ان میدانوں کو فتح نہ کر لیتے ، دشمنوں کے مقابلے میں کیسے بازی جیت سکتے تھے ؟ (۱۹) ۔

یعنی پہلے ایمان " ہجرت میں بچتا " نظر آتا تھا اور اب چند ماہ کے بعد ملک کے اتحاد اور قربانیوں میں ایمان کی کامیابی کی صورت پیدا ہو گئی !

ہجرت کی اس بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس " مقدس مشن " کو جہاں " ثمرات و برکات " کا باعث ہونا چاہیئے تھا وہاں یہ فلاکت و ہلاکت کا سبب بن گیا ۔ یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ جوش و جذبے سے سرشار ہزاروں مسلمان اپنا گھر بار اونے پونے فروخت کر کے ، کاروبار چھوڑ کر ، عزیز و اقارب سے جدا ہو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک انجانے دیس کو روانہ ہوگئے جس کی زبان بھی وہ نہیں جانتے تھے، رسم رواج سے بھی ناواقف تھے۔ صرف اس موہوم خیال پر کہ وہ ایک اسلامی ملک "دارالسلام کو جا رہے ہیں۔ ایک ایسے اسلامی ملک کو کہ جو خود پسماندہ اور ہر لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ نہ بھیجنے والوں کا پتہ تھا، نہ "میزبانوں" کی خبر۔ شاید امیر کابل نے "شاہانہ مروت" میں اس توقع پر ہلہ شیری دے دی ہو کہ چند سو پڑھے لکھے، ہنر مند لوگ آجائیں گے، جو افغانستان کی کمزور معیشت پر بوجھ نہیں بنیں گے بلکہ وہاں کی تعلیم و ترقی کے پروگراموں میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں آگئے جن میں تعلیم یافتہ کم تھے ..... پھر انگریزوں اور امیر کابل کے درمیان صلح نامہ کا مستقل معاہدہ ہو جانے سے صورت حال یکسر بدل گئی اور مہاجروں کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی بات ہوگئی۔ یہ تھا اس غیر منظم تحریک کا انجام! مگر ابھی ڈراپ سین نہیں ہوا۔

چند ماہ کی ذلت و خواری کے بعد بیشتر لوگ تو واپس اپنے وطن لوٹ آئے۔ واپس آکر ان پر جو کچھ بیتی ہوگی اسکا اب تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ تسکین ضرور ہوئی ہوگی کہ اپنا دیس ہے۔ اپنے لوگ ہیں۔ اپنی زبان، اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ گزر اوقات کا سامان بھی ہو جائے گا۔ بہت کم لوگ تھے جو افغانستان میں رہ سکے۔ ان میں سے بھی بعض کچھ عرصہ کی قسمت آزمائی کے بعد واپس آگئے۔ ہجرت کرنے والوں میں جو زیادہ ہی جذبے والے اور ارادے کے مالک تھے اور گھروں سے دین کی خاطر سرفروشی کے لئے نکلے تھے ان کے سامنے یہی راستہ تھا کہ پسپائی کے بجائے قدم آگے بڑھائیں اور اناطولیہ پہنچیں اور وہاں ترکوں کے شانہ بشانہ جہاد آزادی میں حصہ لیں۔ ہرچہ بادا باد۔ مگر ان سرفروشوں کے لیے مصیبت یہ تھی کہ اناطولیہ پہنچنے کے لئے روس سے گزرنا اور دور دراز کا سفر طے کرنا ضروری تھا۔ روس میں نیا نیا بالشویک انقلاب آیا تھا اور مختلف علاقوں میں ابھی شورش جاری تھی۔ خصوصاً ترکمان اپنی آزادی کے لئے ملحد بالشویکوں سے نبرد آزما تھے۔ خطرات سے پر اس وادی سے گزر بھی گئے تو روس میں بالشویکوں کا لادینی نظام ایک اژدہے کی طرح منہ کھولے اہل دین کے جذبہ و ایمان کی آزمائش کے لئے موجود تھا۔ بالشویکوں نے روس میں انقلاب کے بعد دوسرے ملکوں میں اپنے نظام (کمیونزم) کو پھیلانے کے لئے درس گاہوں کے نام سے پراپیگنڈہ ورکشاپیں کھول رکھی تھیں۔ جن میں دوسرے ملکوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلابی نوجوانوں کی برین واشنگ کرکے اور انہیں کمیونسٹ پراپیگنڈے اور تخریبی کارروائیوں کی تربیت دے کر ان کے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ان درس گاہوں میں تاشقند کی محنت کشوں کی مشرقی یونیورسٹی میں ہندوستان سے آئے ہوئے نوجوانوں کی "تعلیم و تربیت" کے سربراہ ایم۔ این رائے تھے۔ بعد میں یہ یونیورسٹی ماسکو میں آگئی تھی۔ وہ مسلمان نوجوان جو اسلام کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اپنے وطن سے نکلے تھے وہ ان پراپیگنڈہ ورکشاپوں میں ایسے پھنسے کہ اکثر ان میں الحاد و بے دینی کے سانچے میں ڈھل کر اپنے وطن کو لوٹے۔ کمیونزم کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ ان نوجوانوں کو انقلابی بنا کر انقلاب لانے کی خاطر ان کے ملکوں کو خفیہ طور سے بھیجا گیا۔ جنوبی ایشیا میں کمیونزم، سوشلزم اور لیبر تحریکوں میں کام کرنے والے اکثر وہی مخلص نوجوان نظر آئیں گے جو تحریک خلافت کے دوران اسلامی جوش و جذبے کے ساتھ ہجرت کرکے گھروں سے بے گھر ہوئے تھے اور شکاریوں کے ہتھے چڑھ کر دولت ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور دنیا میں بھی سرخرو نہ ہو سکے۔ ان پر جو کچھ بیتی وہ ایک الگ کہانی ہے۔ کچھ نوجوان جو اس آہنی شکنجے سے جان و ایمان سلامت لے کر نکل سکے اور بہ ہزار دشواری اناطولیہ پہنچے یا یورپ پہنچ گئے انہیں بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ اناطولیہ پہنچ کر کچھ نوجوانوں کے جذبہ جہاد کو آسودگی مل سکتی تھی، مگر وہاں بھی مصطفیٰ صفیر جیسے ناپاک برطانوی ایجنٹوں کی بدولت ہندوستانی مہاجروں کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ غرض یہ کہ زمین ان مہاجروں کے لئے تنگ ہو چکی تھی اور آسمان دور تھا... یہ تھا ایک "مقدس مشن" کا المناک انجام!

"آزادی کی تلاش" کا مؤلف میاں اکبر شاہ کو چند خوش نصیبوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو تین ماہ کے قریب افغانستان میں قدرے بہتر حالت میں گزار کر اور تقریباً دو سال تک روس کی برین واشنگ انقلابی ورکشاپوں میں زیر تربیت رہ کر اپنی جان اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ وطن واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ وطن واپس پہنچتے ہی جب اس کی ملاقات بابو سلطان محمد (دارالعلوم اسلامیہ، نوشہرہ کلاں کے بانی) سے ہوتی ہے تو وہ حیران کن انداز میں اس سے پوچھتے ہیں۔ "پڑھو کلمہ"۔

"میں نے بغیر کسی پس و پیش کے کلمہ سنا دیا"

"دل سے مسلمان ہو؟" دوسری بات انہوں نے پوچھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ " الحمد للہ "۔
" بس یہی کافی ہے۔ ہم اب تعاون کر سکتے ہیں۔ " بابو صاحب صاف اور واضح انداز میں بولے (۲۰)۔

میاں اکبر شاہ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج پشاور میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، جب تحریک ہجرت کا آغاز ہوا، اور اپنے تین ساتھیوں محمد اکبر خان، کوہر عبدالرحمان اور سلطان احمد خان کے ساتھ انہوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی۔ وہ ۱۶ مئی ۱۹۲۰ء کو اتمان زئی سے روانہ ہو کر قبائلی علاقہ سے ہوتے ہوئے جون کی پہلی تاریخ کو چمر قند کنڈاؤ کے راستے افغانستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ سرکانٹی کی چھاؤنی میں تین روز کرنل صاحب کے مہمان رہ کر دریائے کونڑ میں جالہ کے ذریعے وادی کونڑ سے گزرتے ہوئے اگلے روز جلال آباد پہنچے (یعنی ۵ جون)۔ وہاں ان کی ملاقات سپہ سالار نادر خان سے ہوئی۔ ابھی ہجرت کا آغاز ہوا تھا اور مہاجروں کے چھوٹے چھوٹے گروپ افغانستان پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ سردار نادر خان نے انہیں بتایا کہ " امیر صاحب کا حکم ہے کہ مہاجروں کو کابل روانہ کر دیا جائے، انہیں وہاں ٹھہرایا جائے گا۔ افغانستان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتا ہے "۔ تین دن کے سفر کے بعد یہ مہاجر کابل پہنچے اور قاضی عبدالولی پشاوری مہتمم مہاجرین کے ہاں ٹھہرے۔ مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی ملے۔ کابل میں دو روز قیام کے بعد انہیں مہاجرین کے کیمپ جبل السراج بھیج دیا گیا، جو کابل سے پچاس میل دور ایک پر فضا مقام اور بجلی گھر ہے۔ قلعہ سرور خان میں قیام ہوا۔ ابتدائی ایام میں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ خوب ضیافتیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ مہاجروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایک ماہ میں تقریباً دو سو مہاجر اور قلعہ سرور خان میں آگئے۔ تاہم راحت اور آرام میں کوئی خلل نہ پڑا۔ راشن وافر مقدار میں مفت ملتا تھا۔ مہاجرین کی تعداد بڑھی تو جھگڑے بھی بڑھے۔ کمیٹی قائم کی گئی اور عسکری تربیت بھی ڈمی رائفلوں کے ساتھ شروع کی گئی۔ مگر یہ سلسلہ دو تین ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور یک دم حالات بدل جانے سے آزادی کے مزے پھر آزادی کی تلاش کے سفر میں بدل گئے۔ تقریباً تین ماہ افغانستان میں قیام کے بعد مؤلف اپنے ساتھی مہاجروں کے ساتھ روس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سفر مصائب و مشکلات سے بھرپور تھا۔ روس و ایران میں سفر و حضر کا عرصہ تقریباً دو سال رہا اور یہ ہفت خواں طے کر کے زار و زبوں مؤلف ۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگست ۱۹۲۲ء کو پورے سوا دو سال بعد گھر واپس پہنچا... "آزادی کی تلاش" میں انہی سوا دو سال کی داستان بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتیں پیش نظر رہنی چاہییں۔ ایک تو یہ کہ مؤلف نے یہ روداد اپنی یادداشت کے حوالے سے واپسی کے فوراً بعد لکھی (اگرچہ شائع حصول آزادی کے بعد کی)۔ مؤلف نے کہیں کہیں تاریخوں کا التزام بھی کیا ہے اور اکثر جگہ تاریخیں نہیں دیں، یا تاریخ اور سنہ دیا ہے مگر مہینہ نہیں دیا، یا تاریخ اور مہینہ دیا ہے تو سنہ نہیں دیا، یا صرف تخمینی مدت دے دی ہے۔ یہ قدرتی امر تھا۔ اس سے واقعاتی بیان میں بعض جگہ تسامح بھی پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ روداد ایک فرد کی آپ بیتی بھی ہے اور ایک گروہ کی سرگزشت بھی۔ قدرتی طور پر اس میں تاثراتی رنگ بھی آنے گا۔ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس میں مبالغہ آرائی نہ بھی ہو مگر ان تاثرات کی بدولت اس میں حقیقت اور افسانے کا امتزاج پیدا ہو گیا ہے، جو اس قسم کی تصانیف میں بعید از عقل نہیں ہے۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں پڑھ رہا، بلکہ تاریخی مواد کے سلسلے میں ایسی داستان پڑھ رہا ہوتا ہے جس میں حقائق بھی یقینا موجود ہیں مگر جذبات و تاثرات کی گرد میں لپٹے ہوئے۔ ان امور کی وضاحت کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی سہولت کی خاطر ہم چند مواقع کا تجزیہ پیش کر دیں۔

کتاب میں صفحہ ۸۶ پر "افغانستان اور انگریزوں میں صلح کی خبر کا جبل السراج پر بجلی بن کر گرنا" کی سرخی کے تحت یہ رپورٹ پڑھیے جو اس تالیف میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح جبل السراج میں زندگی گذر رہی تھی۔ ہم تھے اور ہماری روزانہ کی پریڈ۔ کبھی ہمیں کوئی مدعو کرتا کبھی ہم کسی کو مہمان بناتے دن ہنسی خوشی بسر ہو رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ اس پر اضافہ جبل السراج کا خوشگوار موسم۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن جلسے کرواتے۔ ہمیں پتہ تھا کہ ہندوستان کی قانونی پابندیوں سے آزاد اور مبرا ہیں۔ اس لئے جو کچھ دل میں آتا وہ کر گزرتے۔ زبان سے بھی فوراً اسکا اظہار و اقرار کر لیتے۔ تقریریں ہمارے لئے موسیقی کا کام دینے لگی تھیں۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت غیر مترقبہ ہے اور پھر ہمارے جیسے لوگوں کے لئے جنہوں نے کبھی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور اچانک اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح آزادی حاصل ہوگئی تو خوشی سے جامے میں پھولے نہ سماتے تھے ۔

لیکن افسوس پردہ بہت جلد ہی اٹھ گیا ۔ ہمارے ذہنوں میں مستقبل کی تصویر جو بہت خوشنما اور دلکش تھی زیادہ دیر نہ رہی ۔ یہ کیا ہوا ؟ ہمارے دلوں میں تو اور کچھ تھا لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس نکلا ۔ ہم کیا سوچ رہے تھے اور کابل کے " امان افغان " نے ہمارے دامن میں یہ کیا لاکر پھینک دیا ؟ " امان افغان " کی خبر کا جتنا اثر ہم نے لیا وہ تحریر میں نہیں آسکتا ۔ یہی خبر مہاجرین کو وہاں سے روانہ کرکے بھوکے پیاسے افغانستان کے پہاڑوں اور جنگلوں سے گزار کر ترکستان اور پھر وہاں سے روس لے گئی ۔ وہ قفقاز کی پہاڑیوں کو پیدل سر کرکے انا طولیہ پہنچے ، اور وہاں سے واپس مفلوک الحال مصیبت زدہ لیکن ہوشیار بن کر وطن واپس پہنچے ۔ وہ خبر یہ تھی ۔

" انگریزوں اور ہمارے درمیان عارضی صلح ہوگئی ۔ اب بمقام راولپنڈی انگریز اور افغان نمائندوں کے درمیان بات چیت ہوگی ۔ غیور افغان قوم عنقریب اپنی بہادری کا صلہ پالے گی ۔ "

یہ خبر بجلی بن کر جبل السراج کی خوشیوں پر گری ۔ مہاجرین کے چہرے غم و غصے سے سرخ ہوگئے ۔ ایک مہاجر بولا " افغانستان کی حکومت نے پشتونوں کے ساتھ غداری کی ہے ۔ کوئی بولا " کیا اسلام کے ساتھ یہ غداری نہیں ؟ " ایک اور نے درمیان میں آواز دی " کیا اب افغانستان اور ہندوستان میں کوئی فرق رہا ؟ " اور پھر خود ہی اس کا جواب دے دیا " نہیں ! " (۲۱)

یہ خبر بہت اہم اور سنسنی خیز ہے ۔ اس کا جو رد عمل مہاجرین پر ہوا ، وہ بھی فطری اور اس کا مرقع بھی دلکش اور مؤثر ۔۔۔ لیکن یہ " عارضی صلح " کب ہوئی ؟ یہ معاملہ تحقیق طلب تھا جبکہ ہجرت اور اس میں بڑا بعد زمانی ہے ۔ یہاں پر مترجم کے حاشیہ نے اسے قاری کے لئے اور بھی گنجلک بنادیا ہے ۔

" انگریزوں اور حکومت افغانستان کے درمیان صلح " کے عنوان سے مترجم (وقار علی شاہ) اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں ۔

۳ مئی ۱۹۱۹ء کو شروع ہونے والی جنگ ۳ جون ۱۹۱۹ء کو بند ہوئی ۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے فاتح ہونے کا اعلان کیا ۔ افغانستان کی طرف سے پہلی دفعہ آزاد افغانستان کا ایک وفد علی احمد جان جو کہ امان اللہ خاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا برادر نسبتی تھا کی رہنمائی میں ہندوستان روانہ ہوا ۔ علی احمد جان ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے اور امیر حبیب اللہ خاں کے ساتھ ہندوستان پہلے بھی جا چکے تھے ۔ وہ امان اللہ خان کی والدہ علیا حضرت کا قریبی رشتہ دار تھا ۔ وفد کے دوسرے اراکین میں سے ایک ہندو نرنجن داس ، امان اللہ کا استاد ڈاکٹر عبدالغنی اور کرنل غلام محمد شامل تھے ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۱۹ء کو افغانی وفد ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا ۔ پشاور سے اراکین کو ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے راولپنڈی لے جایا گیا ۔ برطانوی وفد کے اراکین بھی راولپنڈی آئے ۔ ان کا سربراہ سر ہملٹن گرانٹ تھا اور ساتھ میں سر شمس شاہ ، سر گر بخش سنگھ وغیرہ شامل تھے ۔ ۲۷ جولائی سے گفتگو کی ابتداء ہوئی جو ۸ اگست تک جاری رہی ۔ ۸ اگست کو علی احمد خان اور سر ہملٹن گرانٹ نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے تو افغانستان کی آزادی تسلیم کی گئی ۔ ساتھ ہی ساتھ ڈیورنڈ لائن کو افغانستان اور مملکت برطانیہ کی سرحد تسلیم کی گئی ۔ انگریزوں کی طرف سے امیر افغانستان کو اپنے احسن تعلقات و اچھی نیت کا ثبوت دینے کے لئے کہا گیا کہ عبید اللہ سندھی ، مولانا برکت اللہ ، مہندر پرتاپ اور دوسرے ہندوستانی "تخریب کاروں" کو معطل کیا جائے ۔

سردار احمد علی خان (کذا) نوجوان افغانوں کے نقطہ ء نظر سے بالکل ناکام رہا ۔ کیونکہ مذاکرات کے دوران اس نے ڈیورنڈ لائن کو افغانی اور ہندوستانی سرحد تسلیم کر لیا تھا ۔ پرجوش سردار جو سردار محمود طرزی کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے اس امر کے جاننے پر سخت مشتعل ہوئے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی نظمی سرحد کے سوا اور کسی حد فاصل کو ان کے ملک اور ہندوستانی حدود کے درمیان تسلیم کیا جائے ۔

یہی وہ خبر تھی انگریز اور افغانستان کے درمیان صلح کی ، جو جبل السراج میں مہاجرین پر بجلی بن کر گری (۲۲) ۔

آخری پیرا گراف کو ، جس میں مترجم نے اپنے تاثرات شامل کر دیے ہیں ، نظر انداز کر دیا جائے تو اس حاشیے کی باقی باتیں تاریخی لحاظ سے درست ہیں ، مگر اس بیان کو اگر "آزادی کی تلاش" کے مؤلف کی روداد کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں پورے ایک سال کا فرق ہے ۔ مترجم نے جو تفصیل دی ہے وہ حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں عارضی صلح نامے (۱۹۱۹ء) کی ہے۔ جبکہ مؤلف کتاب ہجرت کر کے افغانستان کی حدود میں جون ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتے میں داخل ہوا، اور اگست ۱۹۲۰ء میں اسے جبل السراج آئے ہوئے تقریباً ڈھائی ماہ ہو چکے تھے۔ یعنی عارضی صلح نامہ کو پورا ایک برس گزر چکا تھا!

در حقیقت اگست ۱۹۱۹ء میں انگریزوں اور افغانستان اور امیر کابل کے مابین متارکہء جنگ کے بعد عارضی صلح نامہ ہوا تھا، اور مستقل معاہدہ صلح ایک سال کے اندر اندر ہونا قرار پایا تھا۔ راقم الحروف کے پاس ان صلح ناموں کا سرکاری ریکارڈ تو نہیں مگر چند شہادتوں سے کم از کم یہ زمانہ متعین ہو سکتا ہے ایک شہادت مولانا عبیداللہ سندھی کی ہے جو مؤقتہ حکومت ہند (کابل) میں وزیر داخلہ تھے اور دوسری شہادت ظفر حسن کی ہے جو ٹھل کے محاذ پر سپہ سالار نادر خاں کے ہمراہ تھے اور جنگ کے بعد وزارت حربیہ میں جنرل نادر خاں کے ذاتی معتمد تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت ان کے آخری قیام سندھ کے دوران عبداللہ لغاری کو املا کروائی گئی تھی۔ اس میں خاصی تکرار بھی ہے اور بہت سی باتوں کو گڈمڈ بھی کر دیا گیا ہے (شاید ضعف دماغی کے باعث)۔ مولانا سندھی نے صلح نامے کا دو جگہ تفصیل سے ذکر کیا ہے (۲۳) اور دونوں جگہ مستقل صلح نامے کا بیان ہے مگر تاریخ کہیں نہیں بتائی۔ ان کے دوسرے بیان کی چند سطور (۲۴) یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

> دہلی میں اب صلح کے لئے وفد تیار ہونے لگا۔ سپہ سالار نادر خاں کا خیال تھا کہ صلح کے وفد کا لیڈر میں بنوں۔ کیونکہ میں نے قلعہ ٹھل فتح کیا ہے لیکن امان اللہ خاں امیر نے جناب محمود طرزی ایڈیٹر اخبار السراج کو صلح پارٹی کا امیر بنا دیا۔ مجھ کو یہ خبر ملی تو بڑا افسوس ہوا، اور نادر خاں ناراض ہو گئے ... جب سردار محمود خاں طرزی امیر امان اللہ خاں کی طرف سے صلح کے لیڈر مقرر ہو کر دہلی جانے لگے تو وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں وفد کا سردار ہو کر دہلی جا رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر اپنے کسی خاص دوست مدبر کو خط لکھ دیں کہ انگریزوں کی چالوں سے جو بہت نازک ہوتی ہیں مجھ کو مشورہ دیتا رہے۔ میں نے سیدالاحرار مولانا محمد علی صاحب جوہر کو خط لکھ دیا کہ ان کی مدد کرتے رہنا۔ اب یہ خط محمود خاں طرزی نے وائسرائے ہند کو پہنچا دیا۔ اس وقت وائسرائے نے کچھ گاندھی کو تسلی دی تھی کہ رولٹ ایکٹ پر نظر ثانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جانے گئی ۔ مگر اس کے برخلاف مولانا محمد علی جوہر کو رولٹ ایکٹ کے تحت چار سال کی جیل کا حکم سنا دیا لیکن حسب وعدہ گاندھی نے اس سزا کو راز میں رکھا ... اس کے بعد مولانا سندھی نے صلح کانفرنس کے سلسلے میں روس کے ساتھ ساز باز اور احمد آباد کانگرس کے جلسے میں آزادی کا جھنڈا لہرانے کی تیاریوں کا ذکر کیا ہے ۔ پھر کہا ہے " قبل اس کے کہ افغان وفد سے وائسرائے ہند شرائط صلح طلب کرے اس نے گاندھی جی اور مالوی جی کو طلب کیا ۔ گاندھی اس وقت احمد آباد کانگرس کے اجلاس کی تیاری میں مصروف تھے ۔ وائسرائے ہند نے دونوں کو بلا کر مولانا سندھی کا خط جو محمود خاں طرزی نے وائسرائے کو دیا تھا ، دکھلایا ... " (۲۵) ۔ " افغانستان کے امیر محمود خاں طرزی شرائط پیش کرنے میں ڈھیل کر رہے تھے ، اور مطلب یہ تھا کہ احمد آباد میں ادھر ہندوستانی آزادی کا جھنڈا لہرا دیں گے ادھر ہم اپنا وفد بلا لیں گے ۔ کانگرس کا وہ جلسہ جو احمد آباد میں ہونے والا تھا ، اس میں صرف بارہ دن باقی تھے ۔ اور ایک سال کے اندر صلح کا وقت ختم ہونے والا تھا ۔ وائسرائے نے محمود خاں طرزی کو بلا کر کہا کہ اپنی جو بھی شرائط ہیں فوراً پیش کر دو ۔ ورنہ واپس چلے جاؤ اور ہم اعلان جنگ کر دیں گے " ۔ (۲۶)

" سرگزشت کابل " میں مولانا سندھی کے ان بیانات میں مجموعی طور پر سب باتیں درست ہوں گی مگر زمانے کا کوئی تعین نہ ہونے کی وجہ سے کچھ گڈ مڈ ہو گئی ہیں ۔ عارضی صلح نامے پر ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو دستخط ہوئے تھے ۔ اس لئے مستقل صلح نامے پر اگر ایک سال کے اندر دستخط ہونے تھے تو یہ تاریخ ۸ اگست ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہو سکتی ہے ۔ رہا وائسرائے کی ملاقات گاندھی جی اور مالوی صاحب سے اور مولانا سندھی کا خط وغیرہ ، تو یہ ملاقات اپریل ۱۹۲۱ء میں شملہ میں ہوئی تھی اور کئی روز تک جاری رہی تھی ۔ اسی ملاقات میں افغانی حملے کا ذکر بھی ہوا تھا ۔ اب رہی احمد آباد کانگرس تو یہ جلسہ دسمبر ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتہ میں ہوا تھا جس میں مولانا حسرت موہانی نے آزادی کامل کی قرارداد پیش کی تھی اور گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی تھی ۔ چنانچہ یہ قرارداد احمد آباد کانگرس میں مسترد ہو گئی تھی ۔

اب ہم مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد ظفر حسن کے بیانات کو لیتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو عارضی اور مستقل صلح ناموں کے بارے میں زیادہ واضح اور حقیقت کے قریب ہیں۔

(۱) ہم کابل میں تین دن رہ کر پھر محاذ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت افغانی ہیئت سردار علی محمد خاں ایشک آقای کی قیادت میں انگریزوں کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لئے راولپنڈی جانے والی تھی۔ ہمارے کابل کے سفر سے اس ہیئت کی بھی بہت ڈھارس بندھ گئی تھی۔ اس نے راولپنڈی میں جو عارضی صلح کا معاہدہ ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو کیا، اس میں انگریزوں کو افغانستان کے استقلال کا پھر قائل کر دیا گیا اور انگریزوں نے افغانی استقلال کی، جس کو انہوں نے متارکہ کے وقت ۲۷ مئی ۱۹۱۹ء کو مان لیا تھا، تصدیق کر دی (۲۷)۔

(۲) آخر کابل سے خبر آئی کہ افغانی وفد کے رئیس سردار محمود بیگ طرزی ہوں گے۔ اس سے سپہ سالار صاحب مرحوم کو بہت مایوسی ہوئی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ یہ وفد انگریزوں سے جرات اور ہمت کے ساتھ گفت و شنید نہ کرے گا اور ان سے مزید رعایت نہ لے سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور یہ وفد منصوری کی کانفرنس صلح میں افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا اور کوئی اچھی شرطیں حاصل نہ کر سکا۔ ہمیں امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلوانے اور ہوم رول قائم کرانے میں ضرور مدد دے سکے گا اور اس طرح ہندوستانی معاونت کا معاوضہ ادا کر سکے گا جسکی وجہ سے انگریز ہندوستان کی بدامنی سے ڈر کر افغانستان پر پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکے اور اپنی ساری فوجوں کو افغانوں کے برخلاف استعمال نہ کر سکے اور ڈکہ کو لے کر وہیں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے اور جلال آباد تک بڑھنے کی جرات نہ دکھلا سکے۔ افغانستان کے وفد کی طرف سے ہندوستان میں ہوم رول قائم کرنے کے بارے میں مدد ملنا تو درکنار، اس وفد کے قیام ہندوستان کے دوران (۱۹۲۱ء کے شروع میں) وہاں ہندوستان سے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کافی کامیابی حاصل کر کے لوٹ آیا (۲۸)۔

ظفر حسن ایبک نے طرزی وفد کی رفت و آمد کے بارے میں کوئی تاریخ تو نہیں دی مگر اس سے زمانہ متعین ہو جاتا ہے۔ ظفر حسن ۱۹۲۰ء میں سردار سپہ سالار نادر خان کے ساتھ جلال آباد میں تھے جب وفد صلح کانفرنس کے لئے ہندوستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روانہ ہوا۔ یہ کانفرنس مسوری (یا منصوری) میں ہوئی جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں ایک صحت افزا مقام ہے۔ گویا یہ کانفرنس موسم گرما میں جولائی، اگست وغیرہ میں ہوئی۔ عارضی صلح نامے کا ایک سال بھی اگست میں ختم ہو رہا تھا۔ اس زمانے کی تصدیق ایک اور ذریعے سے بھی ہوتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے چند نظمیں انہی دنوں میں افغانی وفد کے بارے میں لکھیں تھیں۔ " سیوائے ہوٹل مسوری میں طبلہ پر تھاپ " (ایک منظوم ڈراما، تخلیق ۲۶ مئی ۱۹۲۰ء)۔ واضح رہے کہ افغان وفد کو مسوری (منصوری) کے سیوائے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ دوسری نظم " علامہ طرزی کی غزل کے انتظار میں " (تخلیق ۲۲ جولائی ۱۹۲۰ء) اور پھر ایک قطعہ بھی ہے جس پر کوئی تاریخ تخلیق درج نہیں۔ غالباً یہ استقبالیہ قطعہ ہے۔ بعنوان

"کابل کے درزی"

عقدہ دشوار مشرق کی کشائش کے لیئے
وفد لے کر حضرت محمود طرزی آگئے
ایشیا کا پیرہن یورپ کے ہاتھوں پھٹ گیا
بخیہ کرنے کیلئے کابل سے درزی آگئے

غالباً اگست ۱۹۲۰ء کی کسی تاریخ کو مستقل معاہدہ صلح پر دستخط ہو گئے اور یہی خبر وہ تھی جو کابل اور وہاں سے پھر جبل السراج پہنچی تو مہاجرین پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بعد میں مہاجرین نے ایک جلسہ کیا جس میں ایک بزرگ حاجی معراج دین نے مؤثر تقریر کی۔ اس جلسے کی روداد میاں اکبر شاہ (۲۹) نے اپنے حافظے سے دی ہے جو دلچسپ ہے۔ اس جلسے کے بعد ہی بیاسی مہاجرین کا ایک گروہ روس کے راستے اناطولیہ پہنچ کر وہاں ترکوں کی حمایت میں یونانیوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور ضروری انتظامات کے بعد ہجرت کے اگلے کٹھن سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ مؤلف اور اس کے ساتھی بھی اس گروہ کے ساتھ ساتھ آگے روانہ ہوتے ہیں۔ اگر ان کے قیام افغانستان کے عرصہ تین ماہ کو درست مانا جائے تو مندرجہ بالا تنقیح کے مطابق یہ معاملہ بالکل صحیح ہو جاتا ہے۔

" آزادی کی تلاش " کے صفحہ ۷۳ پر مولانا عبید اللہ سندھی کے بارے میں معلومات بھی تنقیح طلب ہیں۔ مولانا سندھی ۱۹۱۴ء میں نہیں بلکہ اکتوبر ۱۹۱۵ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کابل پہنچے تھے۔ مولانا "کئی بار خفیہ طور پر" ہندوستان نہیں گئے، البتہ ان کے فرستادہ کارکن وہاں جاتے تھے۔ مولانا کابل میں قائم کی گئی "مؤقتہ حکومت ہند" کے صدر نہیں تھے، وزیر داخلہ تھے۔ صدر راجا مہندر پرتاپ تھے۔ مگر اس ہیئت تنظیمی میں سب سے زیادہ فعال مولانا ہی تھے۔ بہرکیف، مؤلف کو اعتراف ہے کہ "ہم نے کابل شہر میں صرف دو دن بسر کئے اس لئے اس شہر کے متعلق میرے مشاہدات سرسری ہیں"۔(۳۰)

افغانستان سے نکل کر آزادی کا سفر بہت پر از خطر اور مہماتی ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں ایک اور قوم "ترکمان" اپنی جنگ آزادی انگریزوں سے نہیں بلکہ روسیوں سے لڑ رہی تھی۔ مہاجرین روسیوں کی حمایت میں ترکمانوں سے لڑتے ہیں کیونکہ "سوویت انگریز کا دشمن ہے"۔ اس لئے ہمارا دوست ہے۔ اس نے ہماری امداد کی اور ہماری خاطر مدارات کر رہا ہے" (۳۱)۔ پھر روس میں مہاجرین کے دو گروہ بن جاتے ہیں۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کی منزل کو جہاد کا نام دیتے ہیں۔ "تاشقند جانا اپنے وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانا تھا، جبکہ اناطولیہ جانا یونانی ظالم کے ہاتھوں جس نے انگریزوں کی امداد سے ترکی پر حملہ کیا تھا، کی مخالفت کرنا تھا" (۳۲)، مؤلف پہلے گروہ کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کی خاطر "جہاد" کے لئے تاشقند پہنچتے ہیں۔ روسیوں کو ہندوستانی "مجاہد" تیار مصالحے کی طرح ہاتھ آجاتے ہیں (۳۳)۔ ایم۔ این۔ رائے (بنگالی انقلابی) کے انقلابی پروپیگنڈے (برین واشنگ) کے طریقے۔ "ہم نے ایک سال سے کچھ کم عرصہ تاشقند میں گذارا۔ بیگم رائے ہمیشہ ہم چند ہندوستانیوں کو ہفتے میں ایک دعوت ضرور دیا کرتی۔ اس دعوت میں رائے کی موجودگی لازمی تھی۔ اس وقت وہ عام گپ شپ ہی لگاتا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ ہندوستان کے انقلاب کے بارے میں وہ ہمارے ساتھ گفتگو کرتا۔ ہم سے ہمارے وطن کے قصے سنتا۔ غرض اس ہفتہ وار گفتگو میں ہمیں وہ چیزیں سکھلاتا جو ہم یونیورسٹیوں میں نہیں سیکھ سکتے تھے" (۳۴) انگریزوں اور روسیوں کے مابین تجارتی سمجھوتے کے سبب تاشقند کا پروپیگنڈہ اسکول بند کر دیا جاتا ہے اور "مجاہدین آزادی" کو ماسکو کی ایشیائی یونیورسٹی میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں "نام کو تو ہمیں بے شمار مضامین پڑھائے جاتے تھے لیکن دراصل سب کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ انگریز سامراج کے خلاف پروپیگنڈہ کا ہنر سیکھنا تھا"... "ہم ایشیا سے یورپ آگئے اور ماسکو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ایشیائی دارالعلوم میں انگریزی سامراج کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے ۔ انگریزی استعمار قسم قسم کے طریقوں سے ایشیا اور ہندوستان کو جونکوں کی طرح کھائے جا رہا تھا ، یہ بات ہمیں مشہور زمانہ انقلابی استاد سکھلا رہے تھے " (۳۵) ۔ اس طرح ماسکو میں بھی بقول ایم ۔ این ۔ رائے ، وطن کی آزادی کے لئے " سائنٹیفک " تعلیم جاری تھی " (۳۶) ۔ پھر " سوویٹ تھیٹر اور سینما بھی پروپینگڈے کا ایک بڑا ذریعہ تھے لیکن پھر بھی تسکین دل کے لئے اچھی تفریح تھی " (۳۷) ۔ " تسکین دل " اور " جنسی تفریح " کے سامان بھی اس اعلیٰ تعلیم کا لازمہ تھے ۔ جس سے " حیادار " مجاہدین اجتناب کرتے رہے مگر کہاں تک ؟ ایک روز ہفتہ وار دعوت میں بیگم رائے سخت طعن آمیز انداز میں کہتی ہیں " تم ہندوستانی لوگ بہت پسماندہ ہو ۔ تمہاری غلامانہ ذہنیت کو یہ آزاد وطن بھی ٹھیک نہ کرسکا ۔ " دریافت کرنے پر مسز رائے نے بتایا ۔ " یونیورسٹی کی لڑکیوں نے اپنے استادوں اور چانسلر کامریڈ رائے کو شکایت کی ہے کہ ہندوستانی طلباء کی ذہنیت بورژوائی ہے ۔ کیونکہ وہ لڑکیوں کے ساتھ کھلنے ملنے سے پرہیز کرتے ہیں ۔ اور ڈرامے دیکھنے بھی نہیں آتے ۔ " (۳۸) ۔ اس کے بعد مؤلف نے بھی عشق فرمایا مگر اپنے رومان کو انہوں نے " سر دلبراں در حدیث دیگراں " کے پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ " اپنے ایک ساتھی (سلیم) کی اپنی زبانی ایک بیان کی نقل من و عن لکھ رہا ہوں ۔ جو پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی ۔ " (۳۹) ۔ مگر جلد ہی یہ بتاکر (ماسکو میں مجھے سلیم کہہ کر پکارا جاتا ۔ اکبر شاہ) یہ پردہ اٹھا دیتے ہیں ۔ بہر حال عشق دلبراں اور عشق انقلاب کی کشمکش بھی اشتراکی نصاب تعلیم کا ایک حصہ تھی (فیض احمد فیض مرحوم کی نظم " دو عشق " بھی اس کی نشاندہی کرتی ہے) آنیا اسایان (ہیروئن) محبوبہ کا کردار محیر العقول نہیں بلکہ انقلابی تربیت کا ایک حصہ تھا ۔ جب ایک پروفیسر یہ نصیحت کرتا ہے " سلیم ۔ یاد رکھو ، تم انقلابی ہو ۔ ! اس وقت انقلاب تمھارا یہ امتحان لے رہا ہے کہ تمہیں وطن کے ساتھ محبت ہے یا نہیں ۔ یاد رکھو دنیا میں انسان ایک وقت میں صرف ایک ہی معشوق کے ساتھ عشق کر سکتا ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم وطن کی آزادی سے محبت رکھتے ہو یا ... " " توارش مکرجی ! " میں نے انہیں جواب دیا ۔ " میں انقلابی ہوں ۔ لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ۔ اس کے ساتھ انقلاب کا کیا واسطہ ؟ " (۴۰) اور آخر کچھ دنوں بعد حالات سے یہ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے ۔ " میں انقلابی ہوں ، اور کسی کی محبت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی " (۴۱) ۔ اور پھر " انقلابی مشن " پر وطن روانہ ہوتے وقت مسز رائے اسایان کی تصویر مع مکتوب لاکر حوالے کرتی ہے " یہ لو سلیم! تمھارے دل کی خواہش پوری ہوگئی " اور اسایان نے اپنے عاشق صادق کو یہ لکھا تھا ۔ " پیارے سلیم! بیگم رائے نے مجھے آپ کا پیغام دیا ۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد رکھا ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم چھ مہینوں کے لئے جا رہے ہو ۔ انقلابیوں کی زندگی میں چھ مہینے کوئی خاص وقت نہیں ۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم کامیاب وکامران واپس لوٹ آؤ ۔ اپنی منزل مقصود کو پہنچنے کے فوراً بعد بیگم کے ذریعے مجھے خط بھیجو ۔ میری تصویر سفر میں تمھارا ساتھ دے گی ۔ اس کو تسلی دیتے رہو کہ خفا نہ ہونے پائے " (۴۲) ۔ اور جان سے بھی عزیز یہ تصویر مؤلف کی خورجین میں بحفاظت اس کے ساتھ ساتھ باکو ، قفقاز ، ایران سے ہوتے ہوئے کراچی اور پھر لاہور پہنچتی ہے ، مگر نیڈوز ہوٹل میں آکر خورجین مع تصویر " حادثاتی " طور پر ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتی ہے (۴۳) اور یہ رومان بھی ماضی کا افسانہ بن جاتا ہے ۔ گھر پہنچ کر چوتھے روز سی ۔ آئی ۔ ڈی انسپکٹر حجرے میں آتا ہے اور بڑی ملائمت سے یہ معنی خیز فقرہ کہتا ہے " میاں صاحب! ہم تو آٹھ مہینوں سے آپ کا انتظار کر رہے تھے ۔ تم تو بہت دیر سے آئے ہو! " آٹھ ماہ پہلے ماسکو میں میاں صاحب کو محبوبہ کی تصویر اور خط دیتے ہوئے بیگم رائے نے الوداع کہا تھا اور ان کا یہ واپسی کا سفر بڑی رازداری سے شروع ہوا تھا... پھر ماسکو سے روانگی کی اطلاع دینے والا کون تھا؟

یہاں پہنچ کر میاں اکبر شاہ " آزادی کی تلاش " کا یہ سفر ختم ہوتا ہے ۔ دوران سفر اس جستجو کے حوالے سے بعض بڑے تیکھے جملے اور سبق آموز مکالمے ملتے ہیں مثلاً " مزار شریف میں وزیر انصاف کے باڈی گارڈ کے ایک سپاہی کا یہ کہنا " کیا آپ لوگوں نے اپنا وطن آزاد کرا لیا جو ترکوں کی امداد کے لئے جا رہے ہو " ، (۴۴) اناطولیہ کو جانے والے ساتھی واپسی پر باکو میں ملتے ہیں تو حاجی معراج دین بڑے دردانگیز لہجے میں اپنی بپتا سناتے ہوئے کہتے ہیں " بھائی ہم نے سب کچھ آزما لیا ۔ غلام ہر جگہ غلام ہی ہوتا ہے ۔ اسکی ہر جگہ بے عزتی ہوتی ہے اور کوئی بھی اس کو انسان کی نظر سے نہیں دیکھتا ۔ " (۴۵)

مصنف نے " آزادی کی تلاش " کے صفحات ۲۶۶ اور ۲۶۷ پر باکو میں قیام کے دوران زکریا نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو جنگ عظیم کے دوران لاہور میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور چند دوسرے طلباء کے ساتھ وطن عزیز کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلامی سے نجات دلانے کے لئے افغانستان چلا گیا تھا ، اور اب چھ سات سال سے روس میں مقیم تھا اور وہاں قابل اعتماد آدمی بن چکا تھا ۔ پھر صفحہ ۲۸۰ پر سلیمان زکریا کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ یہ دونوں ایک ہی ہیں ۔ اصل نام اس نوجوان کا رحمت علی زکریا ہے ۔ سلیمان غالبا روس میں اس کا مستعار نام ہو گا جو اکثر انقلابی نوجوان اپنی مہمات کے سلسلے میں رکھ لیتے تھے ۔ رحمت علی زکریا ایک منچلا مہم جو نوجوان تھا جس کے کچھ حالات ظفر حسن ایبک کی "خاطرات" میں ملتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ہجرت برائے جہاد میں ہم سفر تھے ۔ آزادی کے بعد رحمت علی زکریا پاکستان آئے اور اورینٹل کالج میں چند سال فرانسیسی پڑھاتے رہے ۔ مگر وہ یہاں مطمئن نہیں تھے ، اس لئے ۱۹۵۶ء میں فرانس چلے گئے ، جہاں ان کے بیوی بچے تھے ۔ غالبا پھر کبھی واپس نہیں آئے ۔ ڈاکٹر رحمت علی اپنی مہماتی زندگی کی روداد لکھتے تو بہت دلچسپ واقعات پر مشتمل ہوتی مگر ان کا ایسا کوئی تصنیفی کام راقم الحروف کے علم میں نہیں آیا ۔

میاں اکبر شاہ کی داستان سفر میں عبرت و آگہی کا بہت سامان ہے ۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے ؟ اس کا احساس اس وقت شدت سے ہوتا ہے جب اپنے شامت اعمال سے یہ گم ہو جاتی ہے ۔ پھر اس متاع گم شدہ کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں ۔ اہل درد کے کئی قافلوں کو خاک و خون میں لوٹنا پڑتا ہے ۔ مگر کھوئی ہوئی آزادی دوسروں کے سہارے اور ذریعے سے نہیں ملتی ۔ کوئی دوسرا ملک کسی محکوم ملک کو آزاد کرانے کے لئے آگ میں نہیں کودتا ۔ ہر ملک و قوم کو اپنی آزادی کی جنگ خود ہی لڑنا پڑتی ہے ۔ اس کے لئے قید و بند ، دار و رسن سے گزرنا پڑتا ہے ۔ پھر کہیں بازیافت کی صورت نظر آتی ہے اور آزادی اپنا چہرہ دکھاتی ہے ۔ اگر موجودہ اور آنے والی نسلیں اس طرح کی واقعاتی داستانوں سے کوئی درس عبرت حاصل کر سکیں تو بہت اچھا ہو ۔

حوالہ جات

۱۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۶ء میں دو مرتبہ لندن میں شائع ہوئی ، اور اس کا پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں پریمیر بک ہاؤس ، کچہری روڈ ، لاہور نے شائع کیا ۔

2. Jawaharlal Nehru: *An Autobiography,* London, 1936, pp. 464-65.

۳۔ ظفر حسن ایبک ، "خاطرات" ، مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ میاں اکبر شاہ، "آزادی کی تلاش"، ترجمہ و ترتیب از سید وقار علی شاہ (کاکا خیل)، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔

۵۔ قاضی محمد عدیل عباسی، "تحریک خلافت"، دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۲ء عبدالرزاق ملیح آبادی، "ذکر آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال"، کلکتہ، دفتر آزاد ہند، ۱۹۶۰ء۔۶۔ موجودہ Antalya تقریبا ایک لاکھ آبادی پر مشتمل ترکی کے جنوب مغربی علاقے میں واقع ایک معروف شہر اور بندر گاہ۔

۷۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلے میں ہماری ان معلومات کا ماخذ زیادہ تر دو تصانیف ہیں۔ پہلی گاندھی کے رفیق خاص اور "نوجیون" (گجراتی) اور "ینگ انڈیا" (انگریزی) میں ان کے مدیر معاون اندو لال یاجنیک کی تالیف۔
Gandhi As I Know Him, Delhi, 1943.
اور دوسری قاضی محمد عدیل عباسی کی کتاب "تحریک خلافت" (دوسرا ایڈیشن، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۲ء)۔ قاضی محمد عدیل اس تحریک میں شامل تھے اور پیشہ کے اعتبار سے صحافی بھی تھے۔

۸۔ ظفر حسن ایبک، "خاطرات"، مرتبہ غلام حسین ذوالفقار، ص۸۷۔۱۸۵۔

۹۔ استانبول کے زمانہ قیام میں راقم کا ظفر حسن ایبک سے بہت رابطہ رہا اور ان کی آپ بیتی کی تدوین کے سلسلے میں اکثر مسائل اور واقعات کے بارے میں ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ ہجرت کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ مگر اس وقت خود میں نے اس پہلو سے اس تحریک پر غور نہیں کیا تھا۔ البتہ تحریک خلافت اور ترک موالات پر بہت کچھ پڑھا، سنا اور لکھا بھی، لیکن اس بڑی ہجرت کے بارے میں کبھی یہ خیال بھی ذہن میں نہ آیا تھا کہ یہ کب، کیسے اور کس کے ایماء پر شروع ہوئی؟ ظفر حسن کی طرح میرے ذہن میں بھی، اکثر اور لوگوں کی طرح مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا نام ہی آیا تھا، کیونکہ وہ تحریک خلافت کے بانیوں میں سے تھے اور لسان العصر اکبر کا یہ شعر تو میرے ذہن میں تھا۔

ادھر تائید باری ہے، ادھر تعلیم گاندھی ہے
درمقصود کو کھولے خدا، ہمت تو باندھی ہے

لیکن اتنی بڑی ہجرت اور اس کے انجام پر غور کرتے ہوئے طرح طرح کے خیال ذہن میں آتے ہیں۔ سوچتا رہا کہ یہ مولوی عبدالباری بھی کیسے جذباتی آدمی تھے کہ بلا سوچے سمجھے ہجرت کا فتویٰ دے کر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استانبول میں اس امر کی تحقیق کے لیئے ضروری ماخذ موجد نہیں تھے۔ گذشتہ سال جب واپس پاکستان آیا، تو یہ بوجھ ذہن پر تھا، "خاطرات" چھپ چکی تھی۔ آخر چند ماہ بعد مسئلہ حل ہوا کہ یہ ہجرت کی دعوت تو کسی اور بلند مقام سے دی گئی تھی۔ مولوی عبدالباری صاحب تو محض استفسار کا جواب دینے کے مکلف ہوئے تھے، جسے فتوی نہیں کہا جاسکتا۔

۱۰۔ قاضی محمد عدیل عباسی، "تحریک خلافت"، ص ۱۳۷

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۳۹۔۱۳۸

۱۲ ۔ عبد الرزاق ملیح آبادی، "ذکر آزاد" . . . ، ص ص ۲۵ ۔ ۲۷

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۲۸

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۳۸۔۳۷

۱۵۔ غلام رسول مہر (مرتب)، "تبرکات آزاد"، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۶۔ ۳۰۲

۱۶۔ قاضی محمد عدیل عباسی، "تحریک خلافت"، ص ۴۴

۱۷۔ "مشرق" (گورکھپور)، مورخہ ۸ اپریل ۱۹۲۰ء، بحوالہ قاضی محمد عدیل عباسی، "تحریک خلافت"، ص ۱۴۵

۱۸۔ قاضی محمد عدیل عباسی، "تحریک خلافت"، ص ۱۳۹

۱۹۔ "ذکر آزاد"، ص ۱۴۵

۲۰۔ میاں اکبر شاہ، "آزادی کی تلاش"، ص ۳۸۳۔۳۸۲

۲۱۔ ایضاً۔ ص ۸۷۔۸۶

۲۲۔ ایضاً۔ ص ۴۹۔۴۸

۲۳۔ مولانا عبداللہ لغاری، "مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگذشت کابل"، مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۷۴۔۶۵، ۱۹۸۔۱۹۴

۲۴۔ ملاحظہ ہو ایضاً۔ ص ۱۹۴

۲۵۔ ایضاً۔ ص ۱۹۷

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ ظفر حسن ایبک، "خاطرات"، ص ۱۷۰

۲۸۔ ایضاً۔ ص ۷۹۔۱۷۸

۲۹۔ میاں اکبر شاہ، "آزادی کی تلاش"، ص ۹۱۔۸۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۰۔ ایضا۔ ص۷۷

۳۱۔ ایضا۔ ص۱۷۵

۳۲۔ ایضا۔ ص۱۹۱

۳۳۔ ایضا۔ ص۲۲۹

۳۴۔ ایضا۔ ص۱۹۸

۳۵۔ احضا۔ ص۲۲۹

۳۶۔ ایضا۔ ص۲۲۰

۳۷۔ ایضا۔ ص۲۲۲

۳۸۔ ایضا۔ ص۲۳۴

۳۹۔ ایضا۔

۴۰۔ ایضا۔ ص۲۲۹

۴۱۔ ایضا۔ ص۲۵۲

۴۲۔ ایضا۔ ص۲۵۵

۴۳۔ ایضا۔ ص۳۷۶

۴۴۔ ایضا۔ ص۱۹۱

۴۵۔ ایضا۔ ص۲۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com